اُنظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال

آیاتِ وجدانی

مصنفہ

میرزا یگانہ لکھنوی

مع

محاضرات

از

میرزا مراد بیگ شیرازی

حسبِ فرمائش

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

کریمی پریس لاہور میں باہتمام [illegible] پرنٹر چھپا

۷۸۶

جلوہ فرما حق ہوا باطل گیا

آیاتِ وجدانی

از

میرزا یاسؔ یگانہ لکھنوی

مع

محاضرات

از

میرزا مراد بیگ شیرازی

بفرمایش

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

مطبع کریمی لاہور میں باہتمام میر قدرت اللہ چھپی

سنہ ۱۹۲۷ء

بار اول ایک ہزار

قیمت مجلد ع

A man who knows himself
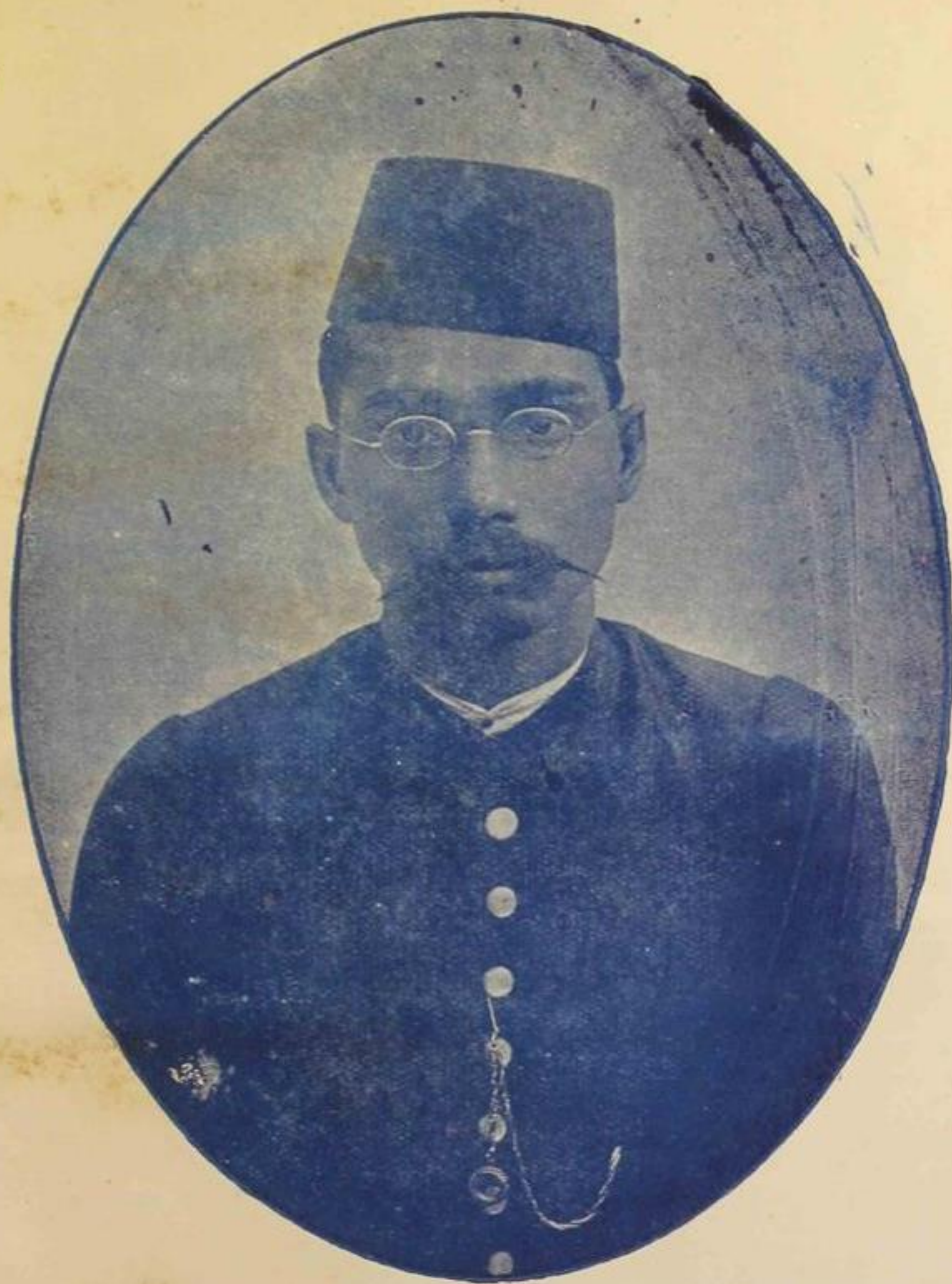
سرا پا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھا نا نہیں آتا

MIBZA YAS 'YGANA'

A LIVING MIND OF THE EAST.

مطمح نظر

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے
پاس کس دن کیلیے ناحق پرستی کیجیے

بسمہ

دیباچہ

آیات وجدانی کیا ہے اور مشرقی لٹریچر میں اس کا کیا مرتبہ ہے؟ اسکا صحیح فیصلہ موجودہ نسل نہیں کر سکتی۔ ہمیں بس اتنا احساس فخر و انبساط کافی ہے کہ مشرق کی ایک زندۂ جاوید شخصیت کا کارنامۂ زندگی پبلک کے سامنے آگیا مصنف کی زندگی کا رنگ بیرنگ دیکھ کر سخت اندیشہ تھا کہ کہیں ادب عالیہ کا یہ سرمایہ گردش روزگار سے پریشان و منتشر نہ ہو جائے۔ الحمد للّٰہ کہ ایسا نہ ہوا۔

موجودہ زمانے کے رواج کے مطابق دیباچہ لکھنا بھی ضرور تھا۔ مگر میں نے اس دیباچہ میں نفس شاعری پر بحث کرنے سے دانستہ قطع نظر کی ہے کیونکہ اُردو میں حقیقت شاعری پر مولانا حالی۔ علامہ شبلی۔ اور مرزا سلطان احمد صاحب وغیرہم کافی ووافی بحث کر چکے ہیں۔ بے شک مصنف کے خاص انداز سخن پر بحث کرنا ضروری تھا مگر میں اس کام کو اوروں پر چھوڑتا ہوں۔ کلام موجود ہے اس پر ہر وقت کُچھ نہ کُچھ لکھنے کا موقع ملتا رہے گا۔ سب سے زیادہ ضروری یہ امر تھا کہ مصنف کی شخصیت اور اس کے طرز زندگی پر جلد سے جلد روشنی ڈالی جاوے تاکہ کچھ دن گزر جانے کے بعد اُس کے سوانح زندگی پر پردے نہ پڑ جائیں۔ اگلے اساتذہ کے دواوین تو موجود ہیں۔ مگر اُنکے

سوانح کے متعلق ہمیں کوئی مفصل اطلاع نہیں ہے۔ اسی لحاظ سے میں نے اس دیباچہ
میں مصنف کے حالات اور طرز زندگی کو واضح کرنا زیادہ مناسب سمجھا تاکہ اُسکے
کیرکٹر اُس کے مطمح نظر کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔ اسی وجہ سے میں نے مصنف کے
'فلسفہ خود پرستی' کو ذرا شرح وبسط سے اس دیباچہ میں بیان کر دیا ہے جس سے
بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی۔ دیباچہ کے علاوہ "آیات وجدانی" کے
متن کے ساتھ ساتھ محاضرات کا دلچسپ اضافہ کر دیا گیا ہے۔ محاضرات سے
میری مراد وہ 'معلومات' اور وہ "سخن ہائے گفتنی" ہیں جو شعر اور شاعر دونوں سے
متعلق ہیں۔ اشعار کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کوئی شرح نہیں ہے بلکہ محض
اشارات اور اجمالی رائیں ہیں یا وہ معلومات ہیں جو شعر پڑھ کر شاعر کے مطمح نظر اُس
کی شاعرانہ زندگی کے معاملات اس کے اخلاق وعادات کے متعلق یاد آگئیں یا وہ
باتیں ہیں جو بر سبیل تذکرہ شعر اور شاعر دونوں کی حقیقت پر روشنی ڈالنے کے لئے
ضروری معلوم ہوئیں۔

اس تمہید کے بعد دیباچے کے سلسلہ میں مصنف کے نام ونسب اور اُسکے
ابتدائی حال پر اک نظر ڈالنا چاہیئے۔

نام ونسب | اس کا نام مرزا واجد حسین تاریخی نام مرزا افضل علی بیگ اور عرف
میں میرزا یاس یگانہ لکھنوی مشہور ہیں۔ پہلے یاس تخلص کرتے تھے۔ مگر بعد میں
شعرائے لکھنو کی لاگ یگانہ تخلص کرنے کا باعث ہوئی۔

نسب نامہ یہ ہے:- مرزا واجد حسین ابن مرزا پیارے صاحب ابن مرزا
آغا جان ابن مرزا احمد علی ابن مرزا روشن علی ابن مرزا حسن بیگ چغتائی بمو خراللذکر

بزرگ اپنے بھائی مرزا مراد بیگ کے ساتھ ایران سے ہندوستان آئے۔ مزید وضاحت کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلہ میں مصنف کا دادیہالی نانہالی ...... شجرہ بھی درج کر دیا جائے:۔

(دادیہالی سلسلہ)

میرزا مراد بیگ چغتائی (یہ دونوں بھائی ایران سے آئے) میرزا احسن بیگ چغتائی

میرزا روشن علی

میرزا اسد علی — میرزا واحد علی — میرزا احمد علی

میرزا میاں جان — میرزا آغا جان — میرزا نواب جان

میرزا امیر حسین عرف میرزا لاڈلے صاحب — میرزا غلام حسین عرف میرزا پیارے صاحب — میرزا افضل بیگ

میرزا واجد حسین یاس یگانہ

(نانہالی سلسلہ)

نواب میرزا آغا جان

نواب میرزا علی حسین خاں عرف چھوٹے بابو صاحب — نواب میرزا علی حسن خاں عرف بڑے بابو صاحب

میرزا محمد حسین — میرزا جعفر حسین — منیر بیگم — عترت فاطمہ بیگم

میرزا واجد حسین یاسؔ

میرزا صاحب کی اہلیہ محترمہ کنیز حسین صاحبہ لکھنؤ کے اک معزز گھرانے کی خاتون ہیں جن کا سلسلہ یہ ہے:۔

میرزا لطف علی شیرازی عرف آغائی صاحب

مولوی میرزا محمد عسکری — حکیم میرزا محمد تقی — حکیم میرزا محمد شفیع

میرزا محمد فصیح — میرزا محمد رضی — میرزا محمد وصی — کنیز رضا

میرزا یاس یگانہ ۔ کنیز حسین

مریم جہان — ام صغری — آغا جان — حسن بانو — آغا شکوہ

میرزا صاحب کی اہلیہ کنیز حسین صاحبہ کی والدہ ماجدہ کنیز فاطمہ صاحبہ بنارس کی تھیں جن کا سلسلہ یہ ہے :۔

حکیم میر محمد باقر صاحب بنارسی

حکیم محمد امیر صاحب

حکیم میرزا محمد شفیع ۔ کنیز فاطمہ صاحبہ

میرزا یاس ۔ کنیز حسین صاحبہ

مرزا صاحب کا مولد خاک پاک عظیم آباد ہے جو حضرت عیسیٰ سے صدیوں پہلے مرکز تہذیب و تمدن تھا۔ اور اب بھی ہے۔ خلجیوں کے وقت سے عظیم آباد اسلامی تہذیب کا مرکز بن گیا۔ سلطنت مغلیہ کے زمانے میں صوبہ کی حیثیت سے مزید ترقی پائی اور عہد عالمگیری سے اب تک مرزا عبد القادر بیدل۔ مولانا راسخ عظیم آبادی۔ شیخ محمد روشن جوشش راجہ شتاب رائے شتاب۔ راجہ رام نرائن موزوں۔ راجہ پیارے لال الفتی۔ شاہ الفت حسین صاحب فریاد۔ مولانا محمد سعید صاحب حسرت۔ خان بہادر مولانا شاد عظیم آبادی۔ جیسے اساتذہ فن پیدا ہوئے۔ اسی مردم خیز خطہ میں مرزا صاحب کا ظہور ہوا۔ مگر یہ شرف لکھنؤ کی قسمت میں لکھا

تھا کہ مرزا صاحب کے حقیقی جوہر وہیں کھلیں گے۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء سے مرزا صاحب
نے لکھنؤ کو اپنا وطن بنا لیا جہاں آپکی دماغی استعداد نے ارتقائی منزلیں طے
کیں۔ لکھنؤ کی سکونت سے پہلے مرزا صاحب کی ابتدائی نشوونما عظیم آباد ہی میں
ہوئی۔ ۱۳۰۱ھ میں مرزا صاحب کی ولادت عظیم آباد کے مشہور و معروف محلہ مغلپورہ
میں ہوئی جو سراسر چغتائیوں کا مسکن تھا اور جن کی دھاک شہر بھر میں بیٹھی ہوئی
تھی۔ یہی وہ محلہ ہے جہاں دہلی کے شاہزادگان و روساء رہتے تھے
نواب آصف الدولہ کے دو بھائی مرزا جنگلی اور مرزا مینڈو کی بھی اسی محلہ میں سکونت
تھی۔ یہی محلہ مرزا صاحب کے بزرگوں کا مسکن تھا۔ مرزا صاحب کے مورث
اعلیٰ مرزا احسن بیگ چغتائی ایران سے ہندوستان آکر سلطنت مغلیہ کے دامن
دولت سے بسلسلہ سپہ گری وابستہ ہوئے اور اُن کے اخلاف کو پرگنہ حوالی عظیم آباد
میں جاگیریں ملیں۔ دو تین پشتوں تک تو تلوار ہاتھ میں رہی پھر سرکار دہلی سے
جاگیریں پاکر مغلپورہ میں عیش و اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔ پہلے تو تمورئے
تھے مگر آخر میں نرے جاگیردار اور گھٹتے گھٹتے زمیندار رہ گئے۔

جاگیروں میں ایک موضع فہیم پور مرزا صاحب کے ہوش سنبھالنے
تک سلامت تھا مگر آئے دن کی مقدمہ بازی کے ہاتھوں خالصے لگ گیا۔ مرزا
صاحب کے والد ماجد مرزا پیارے صاحب اسی مقدمہ بازی میں تباہ رہے۔
اسی وجہ سے مرزا صاحب کو باپ کی طرف سے بجز چند مکانات کے حصہ نہ
ملا۔ جو کچھ ملا وہ اُن کی پھوپھی امتہ الزہرا بیگم صاحبہ کی طرف سے ملا کیونکہ پھوپھی نے
لڑکپن سے مرزا صاحب کو گود لیا تھا۔ پھوپھی نے اتنی جائداد چھوڑی تھی جس سے

دس بارہ برس تک فراغت سے بسر ہوتی رہی۔

ابتدائی تعلیم

مرزا صاحب کی ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید صاحب حسرت عظیم آبادی کے مدرسہ واقعہ محلہ مغلپورہ میں ہوئی جہاں مولوی وزیر علی صاحب رنگپوری اور مولوی محمد عظیم صاحب پشاوری سے مرزا صاحب نے درسیات فارسی کی تکمیل کی۔ فارسی کی تکمیل کے بعد مرزا صاحب عظیم آباد کے مشہور و معروف محمڈن اینگلو عربک اسکول میں داخل ہوئے اوّل سے آخر تک وظیفے اور تمغے اور انعامات پاتے رہے اور ۱۹۰۳ء میں فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی اعظم علی خاں صاحب اور اُن کے استاد مولوی سید علی خاں صاحب بیتاب نے نہایت شفقت و توجہ سے مرزا صاحب کی تعلیم کی۔ مرزا صاحب کی صحیح دماغی نشوونما مذاق شاعرانہ کی اصلاح اور رموز فصاحت و بلاغت کی تعلیم بھی مولانا بیتاب ہی نے فرمائی۔ مولانا بیتاب کو اپنی مصروفیتوں کے باعث فرصت کم رہنے لگی تو آپ نے مرزا صاحب کو اپنے استاد مولانا شاد کے سپرد کر دیا۔ یہاں کی صحبت اک دریائے فیض تھی جہاں بیٹھ کر چند ہی روز میں فکر رسا کو پر لگ گئے۔

۱۹۰۴ء میں مرزا صاحب نے کلکتہ اور مٹیا برج کا سفر کیا مٹیا برج میں شہزادہ مرزا محمد مقیم بہادر کے دو مرشد زادوں نواب محمد یوسف علی مرزا اور نواب محمد یعقوب علی مرزا کے اتالیق ہوئے۔ مگر مٹیا برج کی آب و ہوا نے آپ کی صحت پر ایسا خراب اثر کیا کہ تھوڑے ہی دنوں میں علیل ہو کر عظیم آباد واپس چلے آئے اس علالت کا سلسلہ قریباً سال بھر تک جاری رہا۔ صحت کی حالت اس درجہ

سقیم ہوگئی کہ مرزا صاحب کو امید زیست باقی نہ رہی۔ آخر کار گھبرا کر لکھنؤ تشریف لائے اور یہاں جھوائی ٹولہ میں قیام کر کے حکیم محمد عبد العزیز صاحب لکھنوی سے رجوع کیا لکھنؤ کی آب و ہوا اور وہاں کی دلچسپیوں کا مرزا صاحب پر اتنا خوشگوار اثر ہوا کہ ترک وطن کر کے لکھنؤ کو وطن بنا لینے کا قصد مصمم کر لیا۔ پھر تھوڑے دنوں بعد عظیم آباد تشریف لے گئے اور وہاں اپنی جائداد کا کچھ حصہ فروخت کر کے لکھنؤ واپس آگئے اور یہیں مستقل طور پر رہنے لگے۔ یہاں قدرتاً شعر و شاعری کے مشغلہ میں زیادہ انہماک رہنے لگا۔ مشاعروں میں مرزا یاس کی دھوم ہونے لگی۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں مرزا صاحب کی شادی لکھنؤ کے اک معزز گھرانے میں ہوئی حکیم مرزا محمد شفیع شیرازی جن کا نام شجرہ میں درج ہے لکھنؤ محلہ شاہ گنج کے رہنے والے شہر کے نہایت پرہیزگار و دیندار لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کے بڑے بھائی مولوی مرزا محمد عسکری صاحب نے کربلائے معلٰی میں آخری زندگی بسر کی اور منجھلے بھائی حکیم مرزا محمد تقی صاحب نخاس میں مطب کرتے ہیں۔ شہر کے مشہور اطبا میں ہیں۔ حکیم محمد شفیع صاحب کی پہلی بیوی کنیز فاطمہ صاحبہ کی چھوٹی صاحبزادی کنیز حسین صاحبہ مرزا صاحب کو منسوب ہیں عقد میں نواب محمد عسکری مرزا خاں صاحب عرف بنّن صاحب بلیغ بھی شریک تھے۔ شادی کے متعلق اک قطعہ تاریخ جو آپ نے فرمایا تھا۔ وہ ذیل میں درج ہے:۔

سامان جشن دید ہے مد نظر کہیں — چھائی ہوئی اداسیاں ہیں چہرے پر کہیں

اللہ رے شوق گو کہ سر شام ہے ابھی — خلعت پہن چکا کوئی رشک قمر کہیں

عشرت کدے میں دل کو عروسانہ ہیں خیال — رکھا ہوا ہے شرم سے زانو پہ سر کہیں

آئی مراد گھی کے جلائے گئے چراغ سہرے کے پھول ہنسنے لگے دیکھ کر کہیں

ابتک دماغ بستے ہیں عطر عروس سے جس راہ سے ہوا ہے کسی کا گزر کہیں

لکھے ہیں بہر یاد سن عیسوی بلیغ

ہے جشن عقد یاس کا مد نظر کہیں

سنہ ۱۹۱۳ع

شادی کے بعد سنہ ۱۹۱۴ع میں مرزا صاحب نے اپنا مجموعہ نشر یاس شائع کرایا جس پر اساتذہ لکھنو یعنی حضرت آوج۔ عارف۔ رشید وغیرہ ہم نے پُرزور تقریظیں لکھی تھیں۔ شاعری کے میدان میں لاگ ڈانٹ تو پہلے ہی سے شروع ہوگئی تھی اب ان تقریظوں کو دیکھ کر تمام شعرائے لکھنؤ میں آگ لگ گئی اور یہ چرچے ہونے لگے کہ اساتذہ لکھنؤ نے مرزا یاس کو مسلم الثبوت سخنوربان کر اہل لکھنؤ کی ناک کاٹ لی۔ اُس زمانہ میں یورپ کی جنگ چھڑ چکی تھی۔ ادھر لکھنؤ میں مرزا یاس اور اہل لکھنؤ کی کاغذی جنگ کا بھی زور بندھ گیا۔ سنہ ۱۹۱۵ع میں مرزا یاس نے عروض و قوافی میں ایک رسالہ چراغ سخن لکھ کر حریفوں کے دانت اور کھٹے کر دیئے۔ غرض اب عداوت و بغض کا دروازہ کھل گیا اور روز بروز یہ فتنہ بڑھتا ہی گیا۔ مگر ان عداوتوں کا اُلٹا اثر ہوا۔ مرزا صاحب سا شخص جس کی نگاہ میں کسی سلطنت کی مخالفت بھی سما نہیں سکتی وہ ان حاسدین کی مخالفتوں کو خاطر میں کیا لاتا۔ ان حسد شعاریوں نے مرزا صاحب کے دشمنوں کی کمزوریوں کا یقین دلا دیا اور اسی کے ساتھ اُن کی خود پرستی کی نشوونما ہوتی گئی۔ مرزا صاحب خواجہ آتش کے فدائیوں میں ہیں اور غالب کے بھی بڑے معتقد تھے مگر جب اُنہوں نے یہ دیکھا کہ اُن کے حریف

جو غالب کے مرتبہ سے قطعاً نا آشنا ہیں جھوٹ موٹ غالب کی تعریفیں کیا کرتے ہیں اور خواہ مخواہ خواجہ آتش پر منہ آیا کرتے ہیں تو پھر مقامی ضرورتوں نے انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ غالب کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے یہیں سے غالب پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور یہیں سے مرزا یاس کی خود پرستی کی بنیاد پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی تمام ذمہ داری اہل لکھنؤ پر ہے کہ انہوں نے مرزا یاس ایسے آتش پرست کو خود پرست بنا دیا۔ اب ذرا وضاحت کے ساتھ ہم مرزا صاحب کے فلسفہ خود پرستی پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

خود پرستی کی فلاسفی

(A lesson for thinkers only)

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
یاس کس دن کیلئے ناحق پرستی کیجئے

"اظہارِ فضیلت جسے پبلک اپنی غلط فہمی و جلد بازی سے خود پرستی و خود ستائی پر محمول کرتی ہے اک ناگوار تبلیغی فرض ہے ناواقف و کوتاہ بین جماعت کی تلقین و ہدایت کے لئے یہ ناگوار تبلیغی فرض (خود پرستی) بڑے بڑے پاک باطن ریفارمروں کو بھی ادا کرنا پڑا ہے (A thinker)

اُستادِ فرزانہ مرزا یاس یگانہ لکھنوی عظیم آبادی[۱] کی شخصیت بھی عجیب و غریب ہے۔ دیکھنے میں اک سڑی سودائی دیوانہ مگر یکتائے زمانہ۔ بظاہر خستہ و مضمحل مگر پہلو میں شیر کا دل۔ پریشان روزگار۔ آوارۂ کوچہ بازار۔ مگر دل کا غنی بات کا دھنی سخنور

[۱] فلسفہ خود پرستی، نوشتہ مولانا بلخی بی اے

بالادست۔ نشۂ کمال میں مست۔ بڑے بڑوں کو خطرہ میں نہیں لاتا۔ لکھنؤ میں اپنے
سوا کسی کو موجود نہیں جانتا۔ لکھنؤ کے حشرات الارض کو ہیچ و پوچ سمجھنے والا غالب
ایسے استاد پر بیدھڑک نکتہ چینی کرنے والا مگر اس کے ساتھ ہی غالب کی آخری عمر
کے کلام پر مرنے والا۔ میر انیس۔ میر تقی میر۔ مرزا سودا۔ خواجہ آتش لکھنوی اور
اکبر آبادی کا دم بھرنے والا اور پھر بھی اتنا خود پرست سمجھا جائے یاالٰہی یہ ماجرا کیا
ہے۔ بادی النظر میں جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں یہی اصل حقیقت ہے یا ہماری نظر کا
دھوکا ہے۔

یہ راز ہر ایک کی سمجھ میں آیا ہے نہ آئے گا کہ یہ خود پرستی ہے یا اس کی تہ میں
کوئی گہری فلاسفی پنہاں ہے۔ اور اگر یہ خود پرستی بھی ہے تو کیسی ہے مذموم ہے یا
ممدوح۔ جو لوگ اس دیوانہ خود شناس مرزا یاس کی تحریروں کو محض سرسری نظر
سے دیکھ کر بیدھڑک فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ شخص بڑا مغرور اور خود پرست ہے انہیں
کم از کم جھوٹی تسلی تو ضرور ہو جاتی ہے اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم صحیح نتیجہ پر پہنچ گئے
مگر مشکل اُن لوگوں کے لئے ہے جو اس خود پرستی کی تہ کو پہنچنا چاہتے ہیں اُن کا
دل تو یہ گواہی دیتا ہے کہ ایسا شخص جس کی ذات میں مبداء فیاض نے یہ جوہرِ
سخنوری ودیعت کئے ہیں وہ غالب یا اور کسی باکمال کا منکر ہو ہی نہیں سکتا۔
ہر سخنور دوسرے سخنور کا اعتراف کمال کرنے پر فطرۃً مجبور ہے اعتراف کمال بھی
اک قانون قدرت ہے جس کے عمل سے مرزا یاس کی ذات مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔
اس اٹل قانون کو پیش نظر رکھ کر اور مرزا صاحب کے شاعرانہ فضل و کمال کو تسلیم
کرتے ہوئے اُن کی خود پرستی کا معما حل نہیں ہوتا۔ اس راز کو کم سے کم موجودہ نسل

تو نہ سمجھ سکے گی۔ نہ پبلک کو اتنا موقع ہے کہ اس راز کے دریافت کرنے میں کافی وقت صرف کر سکے۔ نہ اس راز کو دریافت کرنے کی اہمیت اس زمانہ کی پبلک کو محسوس ہو سکتی ہے۔ البتہ اس نسل کے بعد آیندہ نسلوں کو اس خود پرستی کی فلاسفی پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہو گی۔

عدالتوں میں روزمرہ جو چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے مقدمات پیش ہوتے رہتے ہیں اُن کی تحقیق و تفتیش اور جانچ پرتال میں کتنی کوششیں ہوتی ہیں کتنا وقت صرف ہوتا ہے کتنے دماغ مصروف رہتے ہیں کتنی بڑی بڑی مسلیں تیار ہوتی ہیں۔ ماتحت عدالتوں سے لے کر عدالت عالیہ تک کتنے مرحلے طے کرنا پڑتے ہیں جب کہیں ایک مقدمہ کا فیصلہ انصاف و صحت کے ساتھ ہوتا ہے۔ مرزا یاس کی خود پرستی کے معاملہ میں پبلک جو چاہے کہے مگر یہ واضح رہے کہ کسی امر میں محاکمہ کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ جب تک مقدمہ کی مسل کا مطالعہ شروع سے آخر تک بامعان نظر نہ کیا جائے گا اس وقت تک صحیح نتیجہ پر پہنچنا محال ہے۔ پبلک جب شرائط تحقیق ہی بجا نہیں لا سکتی مقدمہ کی کافی تحقیقات ہی نہیں کر سکتی۔ پبلک کے پاس جب اتنا وقت ہی نہیں ہے کہ وہ اس خود پرستی کے اسباب و علل اور اس کی فلاسفی پر غور کر سکے۔ پبلک کو جب یہی نہیں معلوم کہ اس خود پرستی کی ابتدا اور اس کی نشو و نما کب اور کیونکر اور کس ماحول میں ہوئی۔ پبلک کو جب اس بات کی خبر ہی نہیں کہ خود لکھنؤ کی فرعونیت اور حماقت نے مرزا یاس کو آتش پرست سے خود پرست ہو جانے پر مجبور کر دیا تو ایسی بے خبری و ناواقفیت کی حالت میں پبلک کو محاکمہ کرنے کا کیا حق حاصل

ہے۔ رائے زنی کرتے وقت کوئی کسی کی زبان تو پکڑ نہیں سکتا مگر ایسی رائے زنی جو ناواقفیت یا ناقص معلومات پر مبنی ہو کہاں تک حق بجانب کہی جاسکتی ہے۔ فقط یاؔس صاحب کی تحریروں کو سرسری نظر سے دیکھ کر ان کی خود پرستی کو بےجا ٹھہرانا اور اپنے ناقص فیصلہ کو صحیح سمجھ لینا اہل تحقیق کو مطمئن نہیں کرسکتا۔ مرزا یاؔس کی خود پرستی کے فلسفہ کو سمجھنے کے لئے نگاہ میں وسعت پیدا کرنے اور صفحات تاریخ سے مدد لینے کی ضرورت ہے بغیر اس کے صحیح نتیجہ پر پہنچنا معلوم۔

صفحات تاریخ شاہد ہیں کہ جب کبھی دنیا میں کسی مصلح یا ریفارمر کا ظہور ہوا ہے جس نے دنیا میں آکر کچھ کارنمایاں کئے ہیں۔ رسمیات بیہودہ۔ معتقدات فرسودہ اور توہمات باطلہ کی اصلاح اور پبلک کے دماغ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی ہے تو اُس کے خلاف ہمیشہ انواع واقسام کے طوفانِ بغاوت اُٹھتے رہے ہیں۔ ملک وملت کی طرف سے اُس کو جاہل۔ بے ایمان۔ دغاباز۔ فتنہ پرداز وغیرہ وغیرہ خطابات ملتے رہے ہیں مگر وہ کبھی اپنے مشن کو پبلک کے خوف سے ترک یا ملتوی کرنا گوارا نہیں کرتا۔ ذلت ورسوائی گوارا کرتا ہے ایذائیں اُٹھاتا ہے انواع واقسام کی قربانیاں کرتا ہے مگر اپنے مشن سے باز نہیں آتا۔ اثنائے جدوجہد میں اُسے یہ ضرورت بھی پیش آتی ہے کہ وہ ناواقفوں اور کوتاہ اندیشوں کو اپنی خداداد بزرگی وفضیلت سے آگاہ کرے وہ کھلے کھلے لفظوں میں اپنی زبان سے اپنی خداداد قابلیت کا اظہار کرکے اتمام حجت کرتا ہے اس اتمام حجت وا ظہار فضیلت پر وہ اپنی قوم کے ہاتھوں نشانہ ملامت ہوتا ہے دشنام سنتا ہے۔ دربدر خاک بسر ہوتا ہے مگر اپنے مشن سے باز نہیں آتا۔ اب

اسے تم اُس کی خودستائی و خود پرستی سمجھو یا اک تبلیغی فرض مگر یہ ناگوار فرض ادا ہی کرنا پڑتا ہے۔

مذہبی ریفارمر ہو یا ملکی۔ اخلاقی ریفارمر ہو یا ادبی ہر ایک کو اپنی زندگی میں یہ ناگوار فرض (جسے تم خودستائی سمجھو گے) ادا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دور کیوں جاؤ۔ مرزا غالب ہی کو دیکھ لو۔ غالب کون تھا۔ ایک ادبی ریفارمر تھا جو بدو فطرت سے دنیائے شعروسخن میں ایک خاص مشن لے کر آیا تھا۔ کیا غالب کو نادان و بے خبر پبلک کے سامنے اس ناگوار فرض (خودستائی) کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیا غالب نے خودستائی اور اپنے معاصرین پر حملہ کرنے اور اُنکی قلعی کھول دینے میں کوئی کسر اُٹھا رکھی۔ میر تقی میر کی زندگی اسی خود پرستی کی بدولت جتنی تلخ ہو گئی وہ کیا آپ کو معلوم نہیں عرفی کے فضل و کمال کا کون منکر ہو سکتا ہے مگر کیا اس سے بڑھ کر کوئی مغرور و خود پرست گزرا ہے۔ یہ تو سب کے سب ادبی ریفارمر تھے ان کا ذکر چھوڑیئے ذرا امام پیغمبر کے طرز عمل پر نظر کیجئے۔

کیا امام و پیغمبر کو نادان پبلک کے سامنے یہ ناگوار فرض (خودستائی) ادا نہیں کرنا پڑا۔ آنکھیں کھولئے اور غور سے دیکھئے۔ یاس عظیم آبادی کی نسبت یہ کہنا کہ "اس خود پرستی کی کیا ضرورت ہے آپ میں کوئی جوہر ہوگا تو پبلک خود ہی پرکھ لے گی" ذرا غور تو کرو کہاں تک ٹھیک ہے۔ حضرت علی مرتضٰے نے خطبۂ شقشقیہ میں جو اپنے محامد و اوصاف اس شدّومد سے بیان فرمائے ہیں۔ تم کہو گے کہ اس خودستائی کی کیا ضرورت تھی اگر آپ میں کوئی جوہر ہوتا تو پبلک

خود اعتراف کرلیتی۔ مگر ذرا غور و فکر و انصاف سے کام لو گے تو معلوم ہوگا
کہ پبلک کی ہدایت و تلقین کے لئے اس خودستائی (جسے اہل تحقیق کبھی خودستائی
نہیں کہہ سکتے) اور اتمام حجت کی ایسی ہی ضرورت تھی جیسی اور فرائض کی۔
یہ ایک ناگوار تبلیغی فرض تھا جو علی مرتضیٰ ایسے پاک نفس کو بھی ادا کرنا پڑا۔
آج کوئی شخص اس حقیقت کو کیا سمجھ سکتا ہے یا اُس وقت کے ناواقف و
بے خبر عوام الناس کیا سمجھ سکتے تھے کہ کن حالات و واقعات اور کس ماحول سے
متاثر ہو کر اور کن مصلحتوں کی بنا پر علی مرتضیٰ کو ایسا کرنا پڑا۔
رسول اللہ کو اس کی کیا ضرورت تھی کہ انا مدینۃ العلم وعلیؑ بابہا (میں
شہر علم ہوں اور علی اُس کا دروازہ ہیں) کہہ کر خودستائی کے مرتکب ہوں۔
(معاذ اللہ خاکم بدہن) اگر آپ میں یہ علم و فضل تھا تو پبلک خود اعتراف کر
لیتی خودستائی کی ضرورت کیا تھی۔ اک جاہل و بے خبر معترض یہ کہہ سکتا ہے
کہ اک اُمّی محض کو اتنا بڑا دعویٰ کرنا (انا مدینۃ العلم) کہاں تک زیبا ہے اس
کی ضرورت ہی کیا تھی۔ مگر بندہ نواز جو لوگ حقیقت حال کی خبر نہیں رکھتے جو
غور کرنے کی زحمت نہیں اُٹھا سکتے وہ اس کی ضرورت کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔
ہمیں جب اپنے گرد و پیش کی صحیح معلومات میسّر نہیں تو ہم اُس وقت کے
ماحول کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ پبلک کو جب یہی نہیں معلوم کہ مرزا یاس نے لکھنو
کے خطرناک و پر آشوب ماحول میں کیسی تلخ زندگی بسر کی ہے اور لکھنو کی
فرعونیت کہاں تک مرزا یاس کی خود پرستی کی محرک ہوتی رہی ہے تو اس
حکیمانہ خود پرستی کی داد کیا دے سکتی ہے اور اس خود پرستی کی اہمیت اور اس کی

اشد ضرورت کا کیا اندازہ کر سکتی ہے۔

مولائے مرتضیٰ اور سید الشہدا جناب امام حسین سے زمانہ کیوں پھر گیا۔ پبلک نے آپ کا ساتھ کیوں نہ دیا۔ کیا ان بزرگواروں کے اخلاق ناپسندیدہ تھے کہ پبلک اُن سے پھر گئی؟ استغفراللہ۔ بات یہ تھی کہ ان بزرگواروں کی زندگی کا مشن یہ نہ تھا کہ خواہ مخواہ بھی ناوان و کج فہم پبلک کی ناروا خواہشوں اور نازیبا توقعات و جذبات کی ہمنوائی کریں۔ پبلک کے خوف سے اپنے فرائضِ اخلاقی سے چشم پوشی کریں یہ بزرگوار دنیا میں اس لئے آئے تھے کہ پبلک کو اپنے معیار اخلاق پر کھینچ لائیں نہ اس لئے کہ گمراہ پبلک کے ہم آہنگ و ہمنوا ہوکر زمانہ سازی کے مرتکب ہوں (خاکم بدہن) اور اپنے مشن کو بھول جائیں اُن کا مشن یہ نہ تھا کہ عوام کی نگاہ میں جھوٹی عزت حاصل کر کے ہر دلعزیز بنیں پبلک کو گمراہی و ضلالت میں چھوڑ کر اور اپنا ہوا خواہ بنا کر چین سے زندگی بسر کریں دنیاوی آرام و آسائش کے لالچ میں اپنے مشن کو ترک کر دیں۔ یہ بزرگوار پبلک میں ہر دلعزیز بن کر دوسروں کو دھوکے میں رکھنے اور خود اپنے تئیں دھوکا دینے کے لئے نہیں پیدا ہوئے تھے بلکہ فرائض انسانی بجالانا اور دوسروں کو ان فرائض کی تعلیم دینا ان کا نصب العین تھا۔ اسی پابندی فرائض اور اپنے مشن کے احساسِ ذمہ داری کا نتیجہ یہ تھا کہ پبلک اُن سے پھر گئی اور پھر جو کچھ ایذائیں اور ذلتیں (خاکم بدہن) ان بزرگواروں کو اُٹھانا پڑیں وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ کیا اُس زمانہ میں ایسے لوگ موجود نہ ہوں گے جو یہ الزام رکھتے ہوں گے کہ علی مرتضیٰ اور امام حسین نے پبلک کو اپنا مخالف بنا کر اپنی

ناقابلیت وناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیا اور آپ اپنی زندگی تلخ کر لی۔ مگر کیا کیجیے
اُن کا مشن ہی ایسا تھا جو زمانہ سازی کے اصول کو جائز نہیں رکھتا تھا۔ مختصر
یہ ہے کہ جو شخص اپنی اصلاح وتہذیب نفس کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اپنا
ہی سا فرض شناس دیکھنا چاہتا ہے اسے ابنائے زمانہ کے ہاتھوں ایذائیں اُٹھانا
ہی پڑتی ہیں اسی کے ساتھ اُسے یہ ضرورت بھی پیش آتی ہے کہ وہ کج فہم پبلک
کو اپنے مرتبہ اور اپنے مشن سے آگاہ کر کے اتمام حجت کر دے اس ایذا پسندی
میں اُسے وہ لذت ملتی ہے جس پر دنیا کی ہزارہا لذتیں صدقے ہیں۔ یوں تو جعلسا
ودغاباز، چور اُٹھائی گیرے بھی اپنے اپنے کرتوت سے ایذائیں اُٹھاتے ہیں۔
رسوا ہوتے ہیں مگر انہیں وہ روحانی لذت کیا نصیب ہو سکتی ہے جو ایک فرض
شناس کو سختیاں اُٹھا کر حاصل ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے ابنائے زمانہ کی
نگاہوں میں محض جھوٹی عزت مصنوعی اور عارضی خوشی حاصل کرنے کو اپنی زندگی
کا نصب العین بنا رکھا ہے وہ ان حکیمانہ ایذا پسندیوں کی لذتوں کا اندازہ کیا
کر سکتے ہیں تا درنہ آئی نہ دانی۔ یہی وہ لذتِ ایذا طلبی ہے۔ جس کی طرف مرزا
صاحب نے اشارہ فرمایا ہے ؎

مرے کیساتھ ہوں اندوہ وغم تو کیا کہنا
یقین نہ ہو تو کرے کوئی امتحان اپنا
یاسؔ

مرزا صاحب کے ذکر کے ساتھ امام پیغمبر کا ذکر اس راہ سے نہیں کیا گیا ہے
کہ معاذ اللہ مرزا صاحب بھی امام پیغمبروں کے زمرہ میں داخل ہیں بلکہ یہ ذکر اس
مصلحت سے کیا گیا کہ خود پرستی یا اظہار فضیلت (جو ایک تبلیغی فرض ہے) کی

ضرورت ذہن نشین ہو جائے اور ناواقفوں کو معلوم ہو جائے کہ امام پیغمبر بھی یہ ناگوار فرض ادا کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

اس ادبی ریفارمر کو بھی مقامی ضرورتوں نے (یعنی لکھنو کی فرعونیت وحماقت) اظہار فضل وکمال اور مرزا غالب کے خلاف نکتہ چینی کرنے پر مجبور کیا۔ ورنہ کیا مرزا صاحب اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ خود پرستی اور غالب پر نکتہ چینی لوگوں کو بُری معلوم ہوتی ہوگی۔ مگر وہ اس رازِ حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ وہی خود پرستی جو عام طور پر مذموم سمجھی جاتی ہے ایک خاص وقت پر اور خاص خاص ہستیوں کے لئے جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہو جاتی ہے۔ تم اگر مرزا صاحب کی پوزیشن میں ہوتے تو بغیر سمجھائے سمجھ جاتے کہ لکھنو کی فرعونیت کا علاج خود پرستی کے سوا اور کچھ نہیں۔ لکھنو والے اس قابل نہیں ہیں کہ اُن کی فرعونیت خاموشی کے ساتھ ٹال دی جائے بلکہ اُن کی سر کوبی فرض ہے۔

عوام کا ذکر نہیں اہل تحقیق جب غور وفکر کے ساتھ مرزا یاس کی شخصیت کا مطالعہ کریں گے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ شخص بد و فطرت سے دنیائے شعر وسخن کے لئے ایک خاص مشن لے کر آیا ہے۔ پبلک کو اپنے مذاق سخن اپنے معیارِ حُریت وصداقت کی طرف کھینچنا چاہتا ہے۔ اس مصلحانہ مشن اور احساس ذمہ داری کا تقاضا یہی ہونا چاہئے تھا کہ مرزا صاحب منکروں کو اپنی شخصیت سے آگاہ کر کے اتمام حجت کرتے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اب اسے تم خود پرستی کہو یا ادائے فرض۔ تم کو کیا معلوم کہ فراعنۂ لکھنو کی چشم نمائی کے لئے خود پرستی کی اور اُن کے دماغ سے مادہائے فاسد کو خارج کرنے کے لئے کس قدر تند و تیز و تلخ جلاب دینے کی

ضرورت ہے۔ اگر تم مرزا صاحب کی پوزیشن میں ہوتے اور محسودِ عصر ہو کر حاسدوں کی نگاہ میں خار بن کر کھٹکنے کی قابلیت رکھنے اور لکھنؤ میں رہ کر ایسی تلخ وخطرناک زندگی بسر کرتے۔ عوام کی نگاہ میں جھوٹی ہر دلعزیزی حاصل کرنے اور چین سے خود غرضانہ زندگی بسر کرنے کے بدلے تم دوسروں کے لئے کوئی اصلاحی مشن لائے ہوتے تو تم اس حقیقت کی تہ کو پہنچ سکتے کہ مرزا صاحب کس خطرناک ماحول میں کس ثابت قدمی سے اپنے مشن پر قائم رہے ہیں اور جس ناگوار فرض تبلیغی کو تم خود پرستی سے موسوم کرتے ہو وہ کتنا اہم اور ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عوام کے علاوہ مرزا صاحب کے بعض سچے ہمدرد بہی خواہ بھی اس خود پرستی کو اُن کے حق میں مُضر سمجھتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس خود پرستی کی بدولت مرزا صاحب نے بہت کچھ ایذائیں اُٹھائیں اور اُٹھا رہے ہیں۔ بہت سے مادی فوائد جو زمانہ سازی کی بدولت حاصل ہو سکتے تھے وہ اس خود پرستی کے ہاتھوں حاصل نہ ہوئے مگر کیا کیجئے مرزا صاحب کی نظر آج سے زیادہ کل پر ہے۔ مولانا نثار صفوی نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

خدا ہی اُس دل آگاہ کو صلہ بخشے
جو آج چھوڑ کے کل کا امیدوار رہے
نثار

مرزا صاحب کے دلسوز و ہمدرد جو اس خود پرستی کو باعث مضرّت سمجھتے ہیں اُن کے خلوص ومحبت میں کوئی کلام نہیں مرزا صاحب کو انواع واقسام کی ایذاؤں میں گھرا ہوا دیکھ کر اُن کا دل دُکھتا ہے مگر اُن کے دوستوں کو اس امر کا کافی اندازہ نہیں ہے کہ اس شخص کو ایذا طلبی میں کیا لذت ملتی ہے۔ انہیں اس

کی خبر نہیں ہے کہ اس خود پرستی و ایذا طلبی کے کیا کیا اہم نتائج ظہور میں آنے والے ہیں۔ مرزا صاحب کی موجودہ حالت زار پر نظر کرتے وقت اُن کے احباب اس حقیقت کو سہو کر جاتے ہیں کہ اس چند۔ روزہ زندگی کے بعد ایک حیات بعد الممات بھی ملنے والی ہے جو بغیر ایذا طلبی کے ممکن نہیں۔

مرزا صاحب کے دوستوں کا جو اہم فرض ہے وہ یہ ہے کہ شعر و سخن اور طبقہ شعرا کے لئے جو اصلاحی مشن مرزا صاحب کو انجام دینا ہے اُس میں ہاتھ بٹائیں۔ اور اس مشن میں جو رکاوٹیں ہیں اُنہیں دفع کریں۔

شعر و سخن کے متعلق مرزا صاحب کا مشن یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے لہذا دیگر مخلوقات سے زیادہ اور بہت زیادہ مطالعہ انسان ہی کا کرنا چاہئے انسانی اندرونی و بیرونی دنیا اور اُس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر کی جائے۔ انسان کی ظاہری حالت سے زیادہ اُس کی باطنی حالت پر زور قلم دکھایا جائے فلسفہ فطرت انسانی کے باریک نکتے شاعرانہ انداز سے حوالہ قلم کئے جائیں مختصر یہ ہے کہ انسان ہی کو شاعری کا موضوع قرار دیا جائے۔ انسان کے علاوہ مچھر کھٹمل کتے۔ بلی۔ گائے۔ بھینس۔ بندر۔ ساگ پات۔ آم خربوزے۔ دریا سمندر کوہ و صحرا۔ چاند سورج تارے اور دیگر مظاہر قدرت کو موضوع شاعری قرار دینا اور ان پر کبھی کبھی طبع آزمائی کرنا کوئی بُری بات نہیں ہے مگر مرزا صاحب کا مشن یہ ہے کہ شاعر کی توجہ کی سب سے زیادہ مستحق وہ مخلوق ہے جسے انسان کہتے ہیں۔ کیا فلسفہ فطرتِ انسانی کا سارا ذخیرہ ختم ہو گیا کیا ذات انسانی کے جتنے حقایق و معارف ہیں سب قلمبند ہو گئے کہ اُنہیں چھوڑ کر آم خربوزوں پر نظمیں لکھی

جاتی ہیں اور یہ مہملات نہایت جلی حرفوں میں زیب رسائل کئے جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم ہندوستانیوں پر تقلید کا وہ جن سوار ہے کہ نیک و بد کی تمیز باقی نہیں رہی۔

شاعری کے متعلق تو مرزا صاحب کا مطمح نظر یہ ہے جو مختصر لفظوں میں بیان کیا گیا۔ طبقہ شعرا کی اصلاح کے متعلق مرزا صاحب کا مشن یہ ہے کہ شعرا کو (mental slavery) زنجیر تقلید سے بالکل آزاد رہنا چاہئے۔ لکھنو و دہلی کی تقلید میں پھنس کر بہیترے ہونہار افراد کی دماغی استعداد کی صحیح نشو و نما نہ ہو سکی خصوصاً لکھنو والوں نے جہاں کسی میں دماغی استعداد کے آثار دیکھے اُسے فنا کر دینے پر تل گئے ایسی افسوسناک حالت میں شعرائے بیرونجات کو چاہئے کہ وہ لکھنو اور دہلی کی غلامی سے آزاد ہو کر خود اپنی دماغی استعداد کو ترقی دیں اور آپ اپنی قدر کریں۔ اس سے مرزا صاحب کا منشا یہ نہیں ہے کہ لکھنو اور دہلی کی زبان کا جو سرمایہ ہے اُس سے بالکل قطع نظر کر لی جائے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ مقصد ہے کہ لکھنو اور دہلی کے سرمایہ پر سختی اور زبردستی کے ساتھ فاتحانہ قبضہ کیا جائے غلامانہ و گدایانہ طرز سے لکھنو اور دہلی کا دست نگر نہ رہنا چاہئے۔ یہی مشن یہی معیار حریت یہی فاتحانہ اسپرٹ ہے جس نے لکھنو والوں اور اُن کے سگوں سوتیلوں کو مرزا صاحب کے خلاف بغاوت و شرارت پر آمادہ کیا۔ یہ بغض و عناد محض اس جرم پر تھا کہ مرزا صاحب لکھنو والوں کی شاعری کو اس قدر ہیچ و پوچ کیوں سمجھتے ہیں اُن کے کرتوت کا پردہ کیوں فاش کرتے ہیں۔ لکھنو والوں کے کلام پر ایسے دندان شکن اعتراضات کیوں کئے۔ جن کا جواب کچھ

بن نہیں پڑتا۔ دیکھو مردانگی و غیرت اسے کہتے ہیں۔

ایہا الحاسدین یاد رکھو کہ ان ہتھکنڈوں سے کوئی کسی بھلے آدمی کو صحیح معنی میں ذلیل نہیں کرسکتا۔ مرزا یاسؔ کی یہ فلاسفی بھی یاد رکھنے اور دستور العمل بنانے کے قابل ہے کہ انسان ذلیل ہوتا ہے تو محض اپنی کرتوت سے۔ دوسروں کی گستاخیوں بیہودگیوں سے ذلیل نہیں ہوسکتا۔ مولائے مرتضیٰ اور حضرت سید الشہدا نے اپنی فرض شناسی و حریت پسندی کی بدولت کیا کیا سختیاں برداشت کیں سب و شتم گوارا کئے بادی النظر میں لوگ اُسے ذلت سے تعبیر کریں گے (خاکم بدہن) مگر لاحول ولاقوۃ۔ ذلت تو جب ہوتی کہ وہ خود اپنے جادۂ صواب سے ہٹ جاتے۔

دشمنوں نے مرزا غالب ایسے اکمل روزگار کے خلاف کلکتہ میں کیا کیا شورشیں اُٹھائیں جن سے تنگ آکر مرزا غالب ایسے شخص کو مثنوی باد مخالف میں معافی مانگنی پڑی۔ باشندگان کلکتہ کو آئین خلق و مسافر نوازی کی تلقین کرنی پڑی اپنی عاجزی و درماندگی کا دُکھڑا رونا پڑا۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ کیا مرزا یاسؔ کے دل میں بھی لکھنؤ والوں سے صلح جوئی کا خیال کبھی پیدا ہوا لا واللہ ہرگز نہیں۔ مرزا یاسؔ نے کبھی اہل لکھنؤ کی طرف سے شریفانہ برتاؤ کی امید کو دل میں جگہ دی ہی نہیں۔ مرزا صاحب اچھی طرح جانتے ہیں کہ لکھنؤ کی طرف سے خطا کے سوا وفا کی امید ایک خیال خام ہے ؎

یاسؔ امید وفا از لکھنؤ فکر محال

شیوہ ہائے نامسلمانان برنتابد ہر دلے

کلکتہ میں غالب کے خلاف جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ خود اُن کے ہموطنوں نے

دہلی کے کوتوال کو بھڑکا کر اور قمار بازی کی تہمت رکھ کر اس یگانہ روزگار کو جیل خانہ میں پہنچا دیا۔ مرزا یاس کو بھی بعض اہل لکھنؤ نے جیل خانے بھجوانے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر پورا نہ ہوا۔ البتہ مرزا صاحب کی روزی پر حملہ کر کے کامیاب ضرور ہوئے۔ بے غیرتوں نے غالب مغفور کے نام گمنام خطوط میں مغلظ گالیاں لکھ بھیجیں جس پر مرزا غالب نے ہنس کر فرمایا کہ بدتمیزوں کو گالیاں تک دینے کا سلیقہ نہیں۔ لڑکوں کو ماں کی گالی دیتی ہیں وہ اس وجہ سے کہ لڑکوں کو ماں سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ جوانوں کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اُنہیں بیوی سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ بڈھوں کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں اس لئے کہ اُنہیں بیٹی بہت عزیز ہوتی ہے مگر کمبختوں نے اس بڈھے کو ماں کی گالی کیا سمجھ کر دی جس کی ہڈیاں تک خاک ہو چکی ہوں گی۔ کیا ان شرمناک حرکتوں سے غالب کی آبرو میں فرق آ گیا۔ استغفراللہ انسان ذلیل ہوتا ہے تو محض اپنے کرتوت سے دوسروں کی بیہودگیوں سے صحیح معنی میں ذلیل نہیں ہو سکتا۔ میاں لکھنوی کے ایک شاگرد غالباً... ملیح آبادی نے یا اور کسی نے مرزا یاس کے بعض اشعار پر نہایت غلیظ اور ناپاک مصرعے لگائے۔ جن میں مرزا صاحب کے والدین کی شان میں وہی گستاخیاں کی گئی تھیں جو مرزا غالب کی شان میں ہوئی تھیں[1]۔ میاں ذلیل لکھنوی کا عصا بردار مرزا پور کا ایک گنوار اُن ناپاک مصرعوں کو لکھنؤ بھر میں سناتا پھرا۔ لکھنؤ والوں کی خوشنودی

---

[1] وہ مصرعے ایسے گندے اور ناپاک ہیں کہ نقل کرتے ہوئے دل کانپتا ہے۔ جن حضرات کو مرزا یاس کی ہجو سننے کا شوق ہو وہ مذکورہ بالا مصرعے جناب ذلیل و خفی لکھنوی سے طلب کریں۔ ان کے پاس محفوظ ہوں گے۔

اور اپنی ہر دلعزیزی کی سند حاصل کرنے کی امید موہوم میں خود اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرلیا مگر ان حرکتوں سے مرزا یاس کے مرتبہ میں کیا فرق آگیا۔ اُن کا اعتبار یوماً فیوماً بڑھتا ہی گیا ؎

اخوان کی عداوت سے ہوا شہرۂ یوسف
آتش
کچھ پیش نہیں جاتی ہے قسمت کے دھنی سے

ان غلیظ مصرعوں کی تصنیف کے متعلق صحت کے ساتھ نہیں جا سکتا کہ یہ فعل ملیح آبادی کا تھا یا اور کسی کا۔ مگر لکھنؤ میں ایک کمرہ پر سائل دہلوی کی زبان سے اچانک ایک ایسا لفظ نکل گیا تھا جس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ حرکت ملیح آبادی کی تھی۔ بہر حال یہ حرکت کسی لکھنوی کی ہو یا لکھنویوں کے کسی خوشامدی کی ہو لکھنؤ کے لئے قابل فخر ضرور ہے۔ آفرین وصد آفرین مرزا یاس کو کہ ان مغلظات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حاسدوں کے پاس اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

ان حرکتوں نے لکھنؤ کے اعمالنامے کو اتنا سیاہ کر رکھا ہے کہ دھوے دھوے نہ مٹے گا دنیا ہمیشہ ان حرکتوں پر لکھنؤ کو بُری طرح یاد کرے گی اور لکھنؤ کو سُننا پڑے گا۔ افسوس ہے کہ ان بداعمالیوں کی بدولت خود لکھنؤ نے دنیا کو یہ حق دیدیا کہ اسے بُرا کہے۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں مرزا صاحب نے اپنی غزلیات کا ایک مجموعہ شائع کیا جس پر لکھنؤ کے معتبر اساتذۂ عصر مثلاً حضرت آوج۔ عارف۔ رشید۔ وغیرہم نے ازراہِ قدر شناسی و اعتراف کمال معقول الفاظ میں تقریظیں لکھی تھیں یہ تقریظیں دیکھ کر

ذلیل۔ خفی اینڈ کمپنی انگاروں پر لوٹنے لگے۔ حضرت اوج۔ عارف۔ رشید وغیرہم پر سب و شتم ہونے لگے۔ رسالہ معیار میں (جو ذلیل خفی کمپنی کا آلہ تھا) ان بزرگواروں کی شان میں گستاخانہ آوازے کسے گئے اور یہ واویلا مچائی گئی کہ اساتذہ لکھنؤ نے ایک عظیم آبادی کو مسلم الثبوت صاحب فن مان کر لکھنؤ والوں کی ناک کاٹ لی۔ اور تو اور منشی احمد علی شوق قدوائی کو بھی لکھنؤیوں کی ناک کٹ جانے کی ایذا محسوس ہوئی اُنھوں نے بھی حضرت یاسؔ کے خلاف رسالہ معیار میں جلے دل کے پھپھولے پھوڑ لئے غیرت ہو تو اتنی ہو وقت گزر جاتا ہے بات رہ جاتی ہے۔ کیسے کیسے لوگوں نے یاسؔ عظیم آبادی پر بقدر حوصلہ وار کئے مگر خداداد قابلیت کسی کے مٹائے نہ مٹی۔ کوئی ان حاسدوں سے پوچھے کہ حضرت اوج وغیرہ نے جو مختصر تقریظیں لکھی تھیں وہ آج مرزا صاحب کے فضل و کمال کے سامنے کیا وقعت رکھتی ہیں۔ اُن تقریظوں سے مرزا صاحب کے مرتبہ میں کیا اضافہ ہو گیا وہ تقریظیں تو فقط لکھنؤ والوں کے جلانے تپانے کے لئے لکھوائی گئی تھیں یاسؔ اُن تقریظوں سے یاسؔ نہیں ہوئے بلکہ اپنے زور قلم سے آج ملک میں مرزا صاحب کو جو مرتبہ حاصل ہے کیا وہ ان تقریظوں کی بدولت ہے؟ وہ تقریظیں تو فقط لکھنؤ والوں کے سوا پبلک کے ذہن میں محفوظ بھی نہ ہوں گی یہ یاس کا زور قلم ہے جس نے لوہا منوالیا۔

اسی زمانہ میں جب نشتر یاسؔ پر اساتذہ لکھنؤ کی تقریظوں نے حاسدوں کے دلوں میں آگ لگا رکھی تھی جناب شفق لکھنؤی کے مشاعرہ میں جناب خفی لکھنؤی کے برادر عزیز نے مرزا صاحب کی ہجو اُن کے سامنے پڑھی حاضرین صحبت نے (جن میں مشاہیر شعراء و رؤساء لکھنؤ شامل تھے) نہایت ٹھنڈے دل سے مرزا

صاحب کی ہجو سنی اور چھوٹی ہ کے ہاجی صاحب کو دل کھول کر داد دی۔ کسی بھلے آدمی کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ ارے او بیوقوف لکھنؤ کی شرافت و تہذیب کو کیوں بدنام کرتا ہے لکھنؤ کی بزرگداشت کو کیوں خاک میں ملاتا ہے۔ آگے چل کر صفحات تاریخ میں یہ نازیبا طرزِ عمل لکھنؤ کو نشانہ صد ہزار نفرین و ملامت بنا دے گا۔ مگر یہ خیال ان ناعاقبت اندیشوں کو کیوں آتا۔ وہاں تو یہ نشہ تھا کہ ہم سب اپنے شہر میں بیٹھے ہیں ہمارا اتنا بڑا جتھا اتنا بڑا گروہ ہے۔ بیچارے یاس غریب الوطن تن تنہا ہمارا کیا بنا لیں گے۔ پڑھنے والے نے خوب کڑک کڑک کے ہجو پڑھی سُننے والوں نے لہک لہک کے داد دی۔ مرزا صاحب خاموش بیٹھے سُنتے رہے سُنتے نہ تو کیا کرتے۔ بعد مشاعرہ ہاجی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کمال یہ کیا کہ جب سے اب تک ہجو کا جواب ہجو سے نہ دیا۔ ماں باپ کی شان میں گندے الفاظ سُنے مگر سکوت کیا۔ اپنی زبان کو آلودۂ دشنام نہ کیا۔ اور کچھ کہا بھی تو یہ کہا ؎

یاس امید وفا از لکھنؤ فکر محال   شیوہائے نامسلماں بر نتابد ہر دلے
مزار یاس پہ کرتے ہیں شکر کے سجدے   دعائے خیر تو کیا اہل لکھنؤ کرتے

---

[۱] یہ ہجو تو مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی ایک اور ہجو چھپوا کر چوک میں تقسیم کی گئی تھی۔ جسے مرزا صاحب نے چراغ سخن میں نقل کیا ہے اس کے بعض اشعار یہ ہیں:۔

بنام خداوند بالا و پست   کنم یاس را نیست ہر جا کہ ہست
بہ قرآن کہ خواندیم لاتقنطوا   تفو بر رخ یاس اینک تفو
دل کافران ہیچو دوزخ بود   ز دوزخ پلے یاس مطبخ بود

ماشاءاللہ جناب خفی فارسی بھی خوب کہتے ہیں۔ فردوسی و نظامی یاد آ گئے ۱۲۔

افسوس ہے کہ وہ غلیظ مصرعے جو مرزا صاحب اور اُن کے والدین کی شان میں کہے گئے ہیں نقل نہیں کئے جاسکتے ورنہ پبلک کو لکھنؤ والوں کی تہذیب و متانت کا اندازہ ہو جاتا۔ پبلک ذرا انصاف سے دیکھے۔ اگر یہ ہجو کوئی شخصِ واحد کا فعل ہوتا تو اس کی ذمہ داری بھی ایک ہی شخص پر ہوتی۔ مگر جب تمام حاضرین محفل نے جن میں مشاہیر شعرا اور رؤساء لکھنؤ شامل تھے ٹھنڈے دل سے اس ہجو کو پاس کر دیا اور دل کھول کر داد دی بلکہ اسے اپنے حسد شعار دل کا پھاہا بنایا کسی متنفس کی زبان سے اس ہجو کے خلاف کلمہ برأت نہ نکلا۔ اور کسی کا کیا ذکر خود صاحب مشاعرہ (جن کے بلائے ہوئے مہمان یاس صاحب بھی تھے) اور صاحب مشاعرہ کے استاد جی میاں آرزوے لکھنوی نے بھی خاموشی ہی اختیار کی اور اپنے ہموطن حاجی صاحب کو اس ناشائستہ حرکت سے باز نہ رکھا پھوٹے منہ سے یہ نکلا کہ ہمارے مشاعرہ میں آپ کو کسی مہمان کی ہجو پڑھنے کا حق نہیں ہے[1] تو یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ حاجی صاحب (برادر جناب خفی لکھنوی) کی اس حرکت کی ذمہ داری علی العموم اہل لکھنؤ پر ہے۔ جب سے

---

[1] آرزوے لکھنوی کی اس بزدلی و بیغیرتی کی کوئی حد ہے کہ اپنے مشاعرہ میں ایک غریب الوطن مہمان کی دل آزاری و توہین اپنے ہموطنوں کی خاطر خاموشی سے گوارا کرلی۔ یہ دل آزاری اسوقت روا رکھی گئی تھی جب یاس و آرزو میں پینگ بڑھے ہوئے تھے اُس وقت تک آرزو کو یاس کی دوستی و بہی خواہی کا دعویٰ تھا کیا اس شرمناک واقعہ سے آرزو کی اخلاقی کمزوری بزدلی اور بے غیرتی کا ثبوت نہیں ملتا؟ ارے میاں اسی بزدلی و بے غیرتی کا فیض تھا کہ واجد علی شاہ لکھنؤ سے ٹھنڈے ٹھنڈے مٹیا برج کو سدھارے اور لکھنؤ والوں کی نکسیر تک نہ پھوٹی ؏

اب تک اہل لکھنؤ کی جانب سے اس نازیبا حرکت پر پبلک میں اظہار افسوس و ندامت نہیں کیا گیا اور کیوں کیا جاتا لکھنؤ والوں کو تو فطری حق حاصل ہے کہ وہ بیرونیوں کو گالیاں دیں، ہجویں کریں مضحکے اڑائیں۔ بیرونی تو اسی لئے پیدا ہوئے ہیں کہ ان ناشائستہ حرکتوں پر بھی لکھنؤ والوں کے آگے سر جھکائے رہیں اُف نہ کریں۔ اگر کسی نے کچھ جواب دیا یا اعتراض کیا تو سرکش کہلایا۔ کشتنی گردن زدنی ٹھہرا۔ بائیکاٹ یا شہر بدر کر دینے کے قابل سمجھا گیا مگر لکھنؤ والو یاد رکھو کہ تمہاری یہ فرعونیت یہ خدائی اب نہیں چل سکتی۔ وہ دن لد گئے۔ اب اینٹ کی لینی پتھر کی دینی کا زمانہ ہے۔ آگ کھاؤ گے تو انگارے ......

کیا اس ملی بھگت پر بھی اجتماعی حیثیت سے اہل لکھنؤ ان شرمناک جرائم سے بری ہو سکتے ہیں۔ اہل لکھنؤ نے جب مرزا صاحب کا بائیکاٹ ٹھنڈے دل سے گوارا کر لیا اُن کی ہجویں شوق سے سُنیں تو کیا اب بھی لکھنؤ تعمیم کے ساتھ نفرین و ملامت کا مستحق نہیں ہے۔ اگر لکھنؤ والوں کی ان حرکتوں پر مرزا صاحب اور ساری دنیا لکھنؤ کو تعمیم کے ساتھ برا کہے تو کون سی شکایت کی بات ہے بعض سنجیدہ حضراتِ لکھنؤ کو مرزا صاحب سے شکایت ہے کہ لکھنؤ کو تعمیم کے ساتھ برا کہتے ہیں یہ برا کرتے ہیں۔ میں عرض کروں گا کہ جب تمامی شعرائے لکھنؤ (باستثنائے بعض) نے اشرار لکھنؤ کا ساتھ دیا اور مرزا صاحب کی توہین اور اُن پر ظالمانہ سختیاں روا رکھیں تو پھر لکھنؤ تعمیم کے ساتھ قابل نفرین کیوں نہ ہوتا۔ لکھنؤ نے تو خود اپنی مذمت کا حق دنیا کو دے رکھا ہے۔ پہلے تو کچھ نہ سوجھا اب لکھنؤ کے خلاف تلخ و ناگوار الفاظ سُن کر تکلیف ہوتی ہے۔ اب لکھنؤ کے

سنجیدہ افراد کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ لکھنؤ کے خلاف جو کچھ کہا جائے اُسے برداشت کریں کیونکہ خود اُن کے ہموطنوں نے لکھنؤ کو مستحق ملامت بنادیا ہے۔ اپنا سونا کھوٹا تو پرکھنے والے کو کیا دوش۔ از ماست کہ بر ماست لکھنؤ کے علما و رؤسا بھی جب اس ناگوار صورت حال کا دور سے تماشا دیکھتے رہے اور اپنے اخلاقی فرض کی طرف سے چشم پوشی کی اپنے ہموطنوں کو راہ راست پر لانے سے پہلوتہی کی اپنے قومی اور اخلاقی فرض کو کچھ نہ سمجھے اور ایک غریب الوطن مہمان پر یہ سب ظلم وستم دیکھتے رہے تو اب اُن کا دوسرا فرض یہ ہے کہ لکھنؤ کے خلاف جتنے سخت و سُست الفاظ کہے جائیں اُنہیں شربت کے گھونٹ کی طرح پی جائیں۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ علمائے لکھنؤ کی جوتیوں کو کیا غرض پڑی تھی کہ مرزا یاس کے معاملہ پر توجہ کرتے۔ مگر فرض شناس ضمیر بھی گواہی دے گا کہ افراد قوم میں ایسے ناگوار نفاق ایسی شرمناک جنگ کا دور سے تماشا دیکھتے رہنا اور اصلاح حال کی طرف ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا سخت اخلاقی جرم ہے۔ ذرا غور تو کرو اگر تمہارا امام تمہارا پیشوا اس وقت موجود ہوتا تو کیا ان شرم ناک منافقانہ کشمکش کو دور سے دیکھتا رہتا اصلاح حال کی طرف توجہ نہ کرتا۔ کیا علماء پر جو نائب امام ہیں اصلاح قومی کی کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔ کیا سوسائٹی کی اصلاح علما و رؤساء کا اخلاقی فرض نہیں ہے۔

من آنچہ شرط بلاغ است با تو میگویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

آخر میں ہم یہ ضرور کہیں گے کہ چوک میں مرزا صاحب سے انتقام لینے کے

لئے ڈنڈا لئے پھرنا۔ مرزا صاحب کی آبروریزی کے لئے ایک شخص کو کلکتہ سے بلوانا اور آمادہ انتقام کرنا مشاعرہ میں مرزا صاحب کی ہجو پڑھنا اور چھپوا کر چوک میں تقسیم کرنا۔ مرزا صاحب کے والدین یعنی مردوں کی شان میں گندے اور ناپاک اشعار کہہ کر تشہیر کرنا اور لکھنؤ کی تہذیب و شرافت کو خاک میں ملانا۔ لکھنؤ۔ الہ آباد بنارس کے مشاعروں میں مرزا صاحب کا بائیکاٹ کر کے بزدلی کا ثبوت دینا۔ اور آخر میں مرزا صاحب کی روزی پر حملہ کر کے اپنی طاقت دکھانا لکھنؤ والوں کے ایسے کارنامہائے فتح ہیں جو صفحات تاریخ میں یادگار رہیں گے۔ اس فتح پر لکھنؤ جہاں تک ناز کرے بجا ہے۔ مگر ہم پبلک سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ایسی سختیوں ایسی دل آزاریوں پر بھی اپنی آن بان قائم رکھنا اپنے مشن سے غافل نہ رہنا کوئی آسان کام ہے جس کی پرائیویٹ زندگی کی تلخیاں ناگفتہ بہ حالت کو پہنچ گئی ہوں اور جس کا ماحول اس قدر خطرناک ہو اُس کی خودپرستی کی فلاسفی اور فرض شناسی کی داد تو کیا دی جاتی اُلٹا الزام رکھا جاتا ہے۔ قدردانی عالم بالا معلوم شد جنکی زندگی بسم اللہ کے گنبد میں گزرتی ہے وہ کیا جانیں اخوان الشیاطین سے سامنا ہو۔ تو حقیقت کھلجائے۔ لکھنؤ میں رودادی کی سیر تو دلچسپ ہوتی ہے مگر وہاں رہکر آزادانہ زندگی بسر کرنا لکھنویوں کے حملے روکنا اور اپنے جھنڈے گاڑ دینا ہر کس و ناکس کا کام نہیں بڑے بڑے بوکھلا جاتے ہیں۔ آج تک کسی بیرونی پر نہ ایسے سخت حملے ہوئے نہ کسی بیرونی نے ایسی دلیرانہ مدافعت کر کے میدان مارا۔ یہ سہرا مرزا یاس یگانہ کے سر رہا ہے اور رہے گا۔ والسلام

میرزا امراد بیگ شیرازی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آیاتِ وجدانی

منکہ برنمے تابم دردِ زیستن تنہا
صبحدم چساں بنیم شمع انجمن تنہا

بیسویں صدی کے رُبع اوّل تک ہندوستان نے تین افراد کامل ایسے پیش کئے ہیں جن کے نام نامی ایشیا کے سخنوران علی الاطلاق کی فہرست میں آب زر سے لکھے جائیں گے یا یوں کہئے کہ ان کا نام دیگر مشاہیر ملک سخن کے گروہ میں شامل کئے جانے کے قابل نہیں۔ ان افراد سہ گانہ میں دو تو اردو زبان کیلئے سرمایہ ناز ہیں اور ایک بنگالی زبان کے لئے طرۂ امتیاز۔

اوّل دو شخصیتوں سے میری مراد مولانا اکبر آبادی اور حضرت میرزا یگانہ لکھنوی المعروف بہ میرزا یاس عظیم آبادی سے ہے اور تیسری شخصیت سر ربندر ناتھ ٹگور کی ہے جو ذی کمال ہونے کے علاوہ مادی زندگی اور شہرت عامہ کے اعتبار

سے بھی خلاف معمول کامیاب ثابت ہوئے۔ یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی
کہ شہرت عامہ حاصل کرنے اور مادی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے جن اسباب
وذرائع اور جن قابلیتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ بالکل جداگانہ چیز ہے۔ نفس کمال
بجائے خود ایک حقیقت ہے۔ مگر دنیا کی نگاہ میں حقیقت کو حقیقت ثابت کرنے کے
لئے کچھ ایسی قابلیتوں کی ضرورت پڑتی ہے جو اہل ہنر کی شان سے بعید ہوتی ہیں
اگر کوئی حقیقی شاعر عرض کمال کی خاطر خود نمائی کی قابلیت حاصل کرنا چاہے تو وہ
اپنے فن خاص میں ادھورا رہ جائے گا۔ حقیقت تو حقیقت ہے محض بے حقیقت
باتوں پر رنگ آمیزی کرنا باطل پر حق کا ملمع چڑھانا بھی موجودہ تہذیب وتمدن
کے دور میں اک بڑا فن سمجھ لیا گیا ہے۔ علمی وادبی دنیا پر نگاہ ڈالو تو یہاں بھی
یہی تماشا نظر آئے گا۔ ٹگور کی شاعری تو پھر بھی حقیقت کی جھلک دکھاتی ہے
اُس کی شہرت عامہ اگرچہ مبالغہ سے خالی نہیں مگر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ وجدانی
کیفیت رکھتی ہے۔ فن خود نمائی یا گندم نمائی نے تو ایسے لوگوں کو بانس پر چڑھا
دیا جن کی شاعری میں وجدانی حقایق کی بو تک نہیں جن کے کلام پر صحیح معنی
میں حقیقی شاعری کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ حق تو یہ ہے کہ اک وہبی شاعر
اگر اپنے فن شریف کے علاوہ فن خود نمائی میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہے تو
خود اپنے کمالات معنوی میں ناقص رہ کر طلب الکل فوت الکل کا مصداق ہوگا۔

سخنور علی الاطلاق وہی برگزیدہ ہستی ہے جو درد محبت۔ جذبہ حریت
اور شرف انسانیت کا مظہر ہو۔ جسکی سرشت میں ہمدردی ومحبت، آزادی وحریت
کا جذبہ دیگر جذبات انسانی کی نسبت غالب ہو۔ جو قدرت کے تمام مظاہر ومناظر۔

موالید ثلاثہ کی تمام قلمرو یعنی کائنات کے ذرے ذرے پر اپنے خلقی سوز و گداز سے مغلوب ہوکر محبت کی غائر نظر ڈالنے کا خوگر ہو۔ مگر ان وسیع المعنی الفاظ سے بھی شاعر کی جامع تعریف نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ اوصاف ایک فلاسفر یا ایک ریفارمر میں بھی پائے جا سکتے ہیں۔ پھر ایک فلاسفر ایک ریفارمر اور شاعر میں مابہ الامتیاز کیا ٹھہرا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شاعر کے لئے مابہ الامتیاز اس کی زبان آوری ہے۔ اک فلاسفر بھی حقایق و معارف کی گتھیاں سلجھانے کو سلجھاتا ہے ایک ریفارمر بھی اپنے خطبہ فصیح و بلیغ سے اثر پیدا کر لیتا ہے مگر ایک شاعر علی الاطلاق کے مقابلہ میں اُن دونوں کی زبان گنگ معلوم ہوتی ہے۔ ہر فلاسفر ہر ریفارمر کے لئے شاعر ہونا لازمی نہیں ہے مگر ہر شاعر (بشرطیکہ وہ جائز طور پر اس لقب کا مستحق ہو) فلاسفر بھی ہے اور ریفارمر بھی۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ فلاسفر یا ریفارمر اپنے مطالب و مقاصد کو دلنشین کرنے کے لئے دانستہ کوشش بلکہ کوشش بلیغ کرتا ہے مگر پھر بھی اس خوبی سے سمجھا نہیں سکتا جس طرح شاعر۔ برخلاف اس کے شاعر اپنے پاکیزہ و بے لوث حقایق وجدانی کو ذہن نشین کرانے کے لئے دانستہ کوئی پروپگنڈا نہیں پھیلاتا نہ اُس کا کوئی مخاطب ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے جذبہ باطنی سے مغلوب ہوکر کچھ کہتا ہے اُس کا روئے سخن محض اپنے نفس کی طرف ہوتا ہے مگر چونکہ اُسکی زبان کو ایک قسم کی قوت معجزنما حاصل ہوتی ہے اس وجہ سے سامعین بھی مغلوب الحال ہوکر گویا اُسی کے ماحول میں در آتے ہیں۔ درد و محبت و جذبہ حریت کا احساس اور رموز قدرت سے آگاہی ایک غیر شاعر (فلاسفر۔ ریفارمر وغیرہ) کو بھی ہوتی ہے مگر وہ اپنے مافی الضمیر اور اپنے دقیق مطالب کو شاعر کی طرح دلنشین نہیں بنا سکتا۔

فلاسفر ادنیٰ سے ادنیٰ حقیقت کو بیان کرنے میں صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالتا ہے پھر بھی اُس کے مطالب بڑی مشکل سے ذہن نشین ہوتے ہیں اور کبھی ذہن نشین ہو جانے کے بعد بھی زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتے۔ برخلاف اس کے شاعر بڑے سے بڑے فلسفیانہ نکات و حقایق کو اس خوش اسلوبی سے بیان کر جاتا ہے کہ بھلائے سے نہیں بھولتے۔ شاعر مشاہدات عامہ میں بھی ایسے ایسے حقایق دیکھتا اور دکھا دیتا ہے کہ فلسفی کا ذہن مدتوں اُس طرف منتقل نہیں ہوتا۔

شام و سحر کے مناظر انقلاب بادی النظر میں کتنے پیش پا افتادہ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ادنیٰ سے ادنیٰ تغیر و انقلاب شاعر کی دور بین نگاہوں اور اُس کے دردمند دل میں تلاطم برپا کرتے رہتے ہیں جنہیں صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کے لئے اُس کے سوا اور کسی کا قلم کام نہیں دے سکتا۔

رات بھر شمع کی بزم افروزی کا تماشا۔ صبح کو بھری محفل کا خالی ہو جانا اور شمع انجمن کا تنہا رہ جانا کس نے نہیں دیکھا مگر شاعر کو اُنہیں پیش پا افتادہ مشاہدات میں ایسے جلوے نظر آتے ہیں جنہیں اور کوئی آنکھ دیکھ نہیں سکتی نہ اور کوئی زبان بیان کر سکتی ہے۔ شمع کی محفل آرائی اور صبح کو اُس کے چہرے کی اُداسی پر شعرا نے کیا کیا دردناک و عبرت انگیز مضامین پیدا کئے ہیں مگر مصنف نے شمع سحری کے نظارہ سے متاثر ہو کر دردمندانہ جذبات کی ایسی زندہ تصویر کھینچی ہے جو کسی مرقع سخن میں نہ ملے گی۔

تنہائی و کس مپرسی کی زندگی جیسی تاریک و وحشت انگیز ہوتی ہے اس حقیقت تلخ کو شاعر سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ صبح کو جب بھری محفل خالی ہو

جاتی ہے تو وہ شمع سحری کی کس مپرسی و درد تنہائی کا مشاہدہ کر کے بیتاب ہو جاتا ہے۔ اُس سے شمع کی بیکسی و تنہائی دیکھی نہیں جاتی تو مجبور ہو کر پکار اُٹھتا ہے۔ کہ جب میں خود درد تنہائی (زر روز یستن تنہا) کی تاب نہیں لا سکتا تو اس وقت شمع انجمن کی تنہائی و کس مپرسی کا نظارہ کن آنکھوں سے کروں۔ دیکھو کتنا دردناک جذبہ ہے ایک ایک لفظ سے کیسی ہمدردی کی اسپرٹ نمایاں ہے۔

شمع انجمن سے یا تو وہی موم بتی سمجھ لو جو محفلوں میں جلتی ہے یا نظر کو وسعت دے کر صاحبان جاہ و جلال کی حالت کا تصور کرو جو اپنے زمانہ عروج و اقبال میں زینت صد انجمن رہ چکے ہیں۔ مگر اب انقلاب دہر نے اُنہیں ایسی کس مپرسی میں مبتلا کر دیا ہے کہ اُن کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر دیکھتا بھی نہیں۔ جس کی زندہ مثال قیصر ولیم کی شخصیت ہے۔ یہاں اس نفسیاتی حقیقت پر نظر کر لینا چاہئے کہ وہ بدنصیب جو تمام عمر لذتِ عیش و کامرانی سے آشنا نہیں ہوئے اُن کے لئے گردش روزگار اتنی ناقابل برداشت نہیں ثابت ہوتی جتنی اُن لوگوں کیلئے جو عیش و راحت کے مزے سے آشنا ہو کر اچانک گرفتار مصیبت ہو گئے ہوں جو ہمیشہ مصیبت ہی میں زندگی بسر کرتے رہے وہ درد تنہائی سے ایسے متاذی نہیں ہو سکتے جیسے اہل دول۔ بہادر شاہ کو رنگون میں قید ہونے کے بعد جو ایذائیں پہنچی ہوں گی اُن کا احساس ایک گدائے بے نوا کو کیا ہو سکتا ہے۔ ہم سینکڑوں مفلسوں محتاجوں کو سڑکوں پر دیکھتے ہیں مگر اُن کی حالت زار کے عینی مشاہدے سے بھی جذبہ ہمدردی اتنا مشتعل نہیں ہوتا جتنا بہادر شاہ کے حالات سُن کر مصنف نے اگرچہ شاہان مغلیہ کا جاہ و جلال آنکھوں سے نہیں دیکھا مگر

بزرگوں سے اُن کے افسانے سنے ہیں۔ تاریخوں میں اُن کے تذکرے دیکھے ہیں۔ آثار صنادید کے مشاہدے نے اُس کے دل پر اثر ڈالا ہے۔ وہ اپنے اسلاف کے جلال وجبروت سے اپنی قوم کی موجودہ حالت زار کا تقابل کرتا ہے تو شمع سحری کے پردے میں اُسے آیات عبرت نظر آتے ہیں مگر وہ اپنے دردِ دل کو کسی خاص قوم کی تباہی کے ساتھ محدود کر کے بیان نہیں کرتا بلکہ استعارہ کے پردے میں تعمیم کیساتھ بیان کرتا ہے تاکہ ہر قوم مشاہدات عامہ کے نتائج کا اجمالی لطف اُٹھا سکے۔ مصنف کے کلام کی یہ خصوصیت اوّل سے آخر تک نمایاں ہے کہ وہ کسی خاص قومیت کسی خاص مذہب سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ ہر قوم کے جذبات سے اپیل کرتا ہے دیکھو واقعات وواردات۔ مظاہر ومناظر شاعر کے دل میں کیا کیا تلاطم برپا کرتے ہیں۔ وہ پیش پا افتادہ باتوں کے مشاہدے سے انسانی جذبات کی کن گہرائیوں کی خبر لاتا ہے۔ اسی کو نیچرل شاعری کہتے ہیں افسوس ہے کہ ہندوستان کے بہیترے تعلیم یافتہ اصحاب نے نیچرل شاعری کا مفہوم بس اتنا سمجھ لیا ہے کہ مظاہر ومرئیات کی بے سود نقالی کی جائے جیسے مینہ جھما جھم برس رہا ہے۔ کوئل کوک رہی ہے دریا بہہ رہا ہے چشمے اُبل رہے ہیں۔ آبشاروں سے سریلی صدائیں آرہی ہیں۔ بھلا اس قسم کی بیہودہ وبے نتیجہ محاکات سے انسانی جذبات کی گہرائیوں پر کیا روشنی پڑسکتی ہے۔ نیچرل شاعری کا صحیح مفہوم تو یہ ہے کہ مناظر ومظاہر واقعات وواردات کے مشاہدے سے فطرت انسانی میں جو فاعلی وانفعالی کیفیتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں اُن کی بولتی ہوئی تصویریں کھینچی جائیں۔ محض بے نتیجہ محاکات کوئی شاعری نہیں ہے۔

تا کجا امان یابد از ہجوم جانبازاں
گوشہ گیرِ فانوس سے بہرِ سوختن تنہا

فلسفی اپنی تمام عمر مشاہدات میں گنوا دیتا ہے مگر اس پر بھی اُسے وہ حقایق نظر نہیں آتے جو ایک شاعر کو دکھائی دیتے ہیں۔ حسن و عشق کی حکومت تا قیام قیامت فنا نہیں ہو سکتی۔ شاعر کائنات کے ہر ذرّے میں حسن و عشق کی لہریں محسوس کرتا ہے۔ شمع پر پروانوں کا ہجوم۔ فانوس سے پروانوں کا سر ٹکرانا اور جذبہ شوق میں منزل فانوس سے گزر کر شعلہ شمع تک پہنچ جانا۔ روزمرہ کا مشاہدہ ہے مگر شاعر اس نظارہ میں کشش حسن و عشق کا مطالعہ کرتا ہے اور ایک عجیب و غریب نتیجہ نکالتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا اور دکھاتا ہے کہ حسن کی وہ دیوی جسے شمع کہتے ہیں اپنے جانباز عاشقوں (پروانوں) کے جذبۂ شوق و اضطراب کا عالم دیکھ کر اور خود بھی اسی جذبہ سے مغلوب ہو کر چپ چاپ گوشہ فانوس میں تنہا جل بجھنے کے لئے پناہ لیتی ہے کہ جو کچھ گزرتا ہے اُسی پر گزر جائے اُس کے شعلہ حُسن سے اُس کے جانبازوں (پروانوں) پر کوئی آنچ نہ آئے۔ مگر اللہ ری کششِ حسن اللہ رے جذبہ عشق کہ گوشہ فانوس میں بھی پروانے اُسے پناہ نہیں لینے دیتے خود بھی اُس کی آگ میں کود پڑتے ہیں اُسے تنہا جلنے نہیں دیتے۔ دیکھئے ان محسوسات آتش انگیز کو شاعر نے کس جوش و خروش سے بیان کیا ہے۔ پروانوں کے لئے جانبازاں اور شمع کے لئے گوشہ گیرِ فانوس کے اچھوتے الفاظ لاکر کلام میں کتنی تازگی پیدا کردی ہے۔

صاحبان فکر و اجتہاد کے لئے تازہ حقایق و معارف کی تلاش کچھ ایسی مشکل نہیں ہے۔ اچھوتے سے اچھوتے حقایق دریافت کئے جا سکتے ہیں مگر ان حقایق سے مہتم بالشان نتائج نکالنے کے لئے تازہ سے تازہ استعارے پیدا کرنے کی ضرورت پڑتی ہے مگر روشن و پُر معنی استعارے پیدا کرنا محض فلسفیانہ دماغ سے ممکن نہیں اس کے لئے غیر معمولی دماغی استعداد اور شاعرانہ قوت اختراعی ہونی چاہئے بغیر اس کے زور بیان نصیب نہیں ہوتا۔ اس مقام پر بڑے بڑے صاحب فکر ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اُن کا عُلوِ تخیل قابو میں نہیں رہتا۔ اگر انداز بیان میں تازگی و جدت دکھانا بھی چاہتے ہیں تو یہ جدت طرازی غرابت و ثقالت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور بعض اوقات نہایت مضحکہ انگیز ثابت ہوتی ہے۔

حُسن معانی و بیان کی بہتر سے بہتر مثالیں غالب کے علاوہ دیگر اساتذہ میں بھی پائی جاتی ہیں مگر یہاں جن مضحکہ انگیز جدتوں کا ذکر ہے اُن کی مثالیں جس کثرت سے مرزا غالب کے ہاں موجود ہیں وہ انہیں کا حصہ ہیں۔ جب اُن کے ہاں اعلیٰ سے اعلیٰ مضحکہ انگیز مثالیں موجود ہیں تو ہم اُنہیں چھوڑ کر اور کسی غریب کو کیوں پکڑیں۔ غالب کا مشہور مصرع ہے ؎

دل بہ دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے

دل مجبور کو دل بہ دست و پا کہنا نہایت فصیح و بلیغ عبارت ہے مگر دل بہ دست و پا کے ساتھ لفظ 'افتادہ' کا اضافہ اردو عبارت میں کتنا مضحک اور دشمن فصاحت ہے۔ اس کے بعد ہی 'دل بہ دست و پا' کو برخوردار بستر کہہ دینا شہری دماغوں کے لئے کتنی بڑی بوالعجبی ہے۔ اس استعارۂ عجیب و غریب میں

جدت تو ضرور ہے مگر ایسی جدت کس کام کی کہ بے اختیار ہنسی آجائے۔ علم بیان کی یہ وہ منزلیں ہیں جہاں شاعر کی قوت اختراعی اور ذوق صحیح کا امتحان ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد ٹھنڈے دل سے اس بات پر بھی غور کرو کہ 'پروانہ' کو جانباز' کہنا اور شمع کو 'گوشہ گیر فانوس' سے استعارہ کرنا کتنی اعلیٰ قوت اختراعی اور صحت مذاق کی دلیل ہے۔ انشاء اللہ کسی مقام پر مرزا غالب اور مرزا یگانہ کے اختراعات بدیعہ کی فہرست آمنے سامنے رکھ کر پیش کیجائے گی۔

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ شعر کا ظاہری رُخ تھا کہ شاعر کے دل میں شمع و پروانہ کے مشاہدے سے کیا کیا جذبات موجزن ہوئے اور اس مشاہدے سے نتیجہ ظاہری کیا نکالا گیا مگر ہر ظاہر کا ایک باطن بھی ہوتا ہے۔ شمع و پروانے کے اس نظارہ کو انسانی حسن و عشق سے مطابقت دے کر دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ حسن انسانی کی بھی وہی حالت ہے۔

ذوق میتوان دانست رنگ حُسنِ نادیدہ
ہست شاہدِ عاشق دل بوئے پیرہن تنہا

ادراک و یقین کو جو تقویت حضرت مرزا یگانہ کے اس الہامی شعر سے پہنچتی ہے اُس کے سامنے فلسفہ الٰہیات کا سارا دفتر باطل نظر آتا ہے۔ اثبات وجود باری تعالیٰ پر حکما و شعرا نے کیا کیا زور قلم دکھائے ہیں مگر صدیوں کی مسلسل کوششوں کے بعد شاید ہی کوئی ایسی تصنیف پیش کی جا سکے جو اس مسئلہ کو

شاعر کے اس شعر سے زیادہ دلنشین بنا سکے۔ حسنِ نادیدہ یعنی شاہدِ
مطلق کی حقیقت کا کچھ اندازہ اگر ہو سکتا ہے تو ذوق و ادراک ہی کی وساطت سے
اس مقام پر ساری منطق سارا فلسفہ گنگ نظر آتا ہے۔ مرزا غالب۔ مرزا بیدل
فیضی۔ عرفی۔ نظامی۔ امیر خسرو اور قریباً تمام اساتذہ ہند و عجم کے ہاں ایک سے
ایک بہتر شعر اس موضوع پر موجود ہے مگر حضرت مرزا صاحب کا یہ شعر ہزار دو
ہزار اشعار میں بھی رکھ دیا جائے تو بھی اس کی آب و تاب اپنی جگہ نمایاں رہیگی۔
ٹگور کی شاعری الہیات میں ڈوبی ہوئی ہے مگر غور سے دیکھو مرزا یگانہ کا یہ شعر
معرفتِ حسنِ الٰہی کا ایسا روشن آئینہ ہے جسے دیکھ کر روح بیدار ہو جاتی ہے۔
ٹگور کا مطالعہ کرنے والے اس شعر کی جامعیت و اختصار کے ساتھ 'شاہد عادل'
اور 'بوئے پیرہن تنہا' کی وسعتِ نامتناہی پر غور کریں۔ ایسے ہی اشعار شاعر کو
حیات جاودانی عطا کرتے اور اُسے خدائے سخن منوا لیتے ہیں۔

ہر گلے و ہر خارے فتنہ ہا برانگیزد
الحذر دل حیران صد بہار و من تنہا

شاہد فطرت کی دل آویز ہنگامہ آرائیوں کا نقشہ کھینچنے میں مصنف کے
قلم نے وہ کمال صنعت دکھایا ہے جہاں مصوّر کا قلم ہاتھ سے چھوٹ پڑتا ہے۔
چمنستان فطرت کا گُل کیا ہر خار بھی وہ دل آویزیاں رکھتا ہے کہ دیدۂ بینا محوِ
حیرت رہ جاتے ہیں۔ ان آیات فطرت کی ہنگامہ خیزیوں سے گھبرا کر شاعر پکار اُٹھتا
ہے ے الحذر دل حیران صد بہار و من تنہا۔ ان الفاظ سے جو وجدانی لہر دوڑنے لگتی

ہے اُسے صفحہ کاغذ پر منتقل کرنا ایک مصوّر سے کیونکر ممکن ہے۔ مصوّر صد بہار کی کیفیت تو گلہائے رنگین سے دکھا سکتا ہے مگر "الحذر دل حیران" و "من تنہا" کی معنوی کیفیت کی صورت گری اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔ یورپ کی اندھی تقلید میں ہندوستان کے بہتیرے تعلیم یافتہ حضرات محض مظاہر قدرت کی نقالی کو نیچرل شاعری سمجھتے ہیں مگر یہ لوگ کتنے دھوکے میں پڑے ہیں۔ مرئیات کی صورتگری شاعری کی ایک صنف تو ضرور ہے مگر حقیقت میں شاعر کی اعلیٰ ترین ہنرمندی کا ثبوت خارجی شاعری سے نہیں بلکہ داخلی شاعری سے ملتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ (objective) یعنی خارجی رنگ کی شاعری (subjective) یعنی داخلی رنگ کی شاعری کے مقابلہ میں بچوں کے گھروندوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ انسان کے عالم باطنی کو کمال وضاحت وصنعت کے ساتھ صفحہ کاغذ پر منتقل کرنا شاعرانہ معجز نمائی کی آخری حد ہے اور اس بیسویں صدی میں یہ قدرت مرزا یگانہ کے قلم میں ودیعت کی گئی ہے جو انسان کے احساسات و ذہنیات کو حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ منظر شہود پر لاتا ہے۔ مرزا صاحب میں ایک طُرفہ کمال یہ بھی ہے کہ وہ خارجی (objective) رنگ پر بھی داخلی رنگ (subjective) چڑھا دیتے ہیں۔ شاعر خار و گل کی فتنہ کاریوں کا شاہد کرکے "الحذر دل حیران" اور "صد بہار و من تنہا" پکار اُٹھتا ہے جس سے وجدانی گہرائیوں کا مرقع پیش نظر ہو جاتا ہے۔

خیال کو وسعت دے کر اور خار و گل کا پردۂ مستعار ہٹا کر دنیا کے خوب و زشت کا نگاہ غور سے مطالعہ کیجیے تو ہر مشاہدہ گوناگون حیرت افزائیوں کا طلسم

نظر آتا ہے دنیا کی ذلیل سے ذلیل شے اہل نظر کے لئے ہزاروں سامان دلبستگی
پیش کرتی ہے اور کثرتِ تماشا سے عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انہیں نظرفریبیوں
کو مصنف نے ایک دوسری جگہ ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے ؎

دیکھ کے حُسنِ خوب و زشت انجمن مجاز میں
ہوش و خرد ہیں مبتلا زحمت امتیاز میں

خوب تو خوب ہی ہے اس کے حسن کا کیا کہنا مزہ تو یہ ہے کہ زشت بھی
حُسن سے خالی نہیں ہوتا جس کا نظارہ مُبصروں کو زحمت امتیاز میں مبتلا کر دیتا
ہے اور خوب و زشت کا اطلاق مشکل ہو جاتا ہے۔

شاعری کے ایسے مکمل نمونوں پر غور کرنے سے سلسلہ خیالات کو وہ جنبش
ہوتی ہے معانی و مطالب کا وہ تنوع نظر آنے لگتا ہے کہ شعر کے کمالات صوری
کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا اور دیکھنے والا کچھ نہیں سمجھتا کہ سلسلہ جنبانی خیال
میں الفاظ کی معجز نمائی کو کتنا دخل ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جن معانی و مطالب پر شعر
حاوی ہے اُنہیں الفاظ کا قالب اختیار کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی
ہو گی حالانکہ معانی کے لئے موزوں سے موزوں قالب تیار کرنے سے پہلے
بڑی جانکاہی فکر اور رموز فصاحت و بلاغت سے کامل آگاہی کی ضرورت ہے
افسوس ہے کہ مشرق کی مردہ ذہنیت اس حد کمال کا اندازہ نہیں کر سکتی۔ اگر سرزمین
ہند کا یہ سرمایہ مغربی زبانوں میں منتقل ہو سکا تو اُس وقت دنیا اس حقیقت سے
روشناس ہو سکے گی۔ ٹگور اسی وجہ سے ٹگور ہوئے کہ اُن کے نتائج افکار کا انگریزی
زبان میں ترجمہ ہو گیا ورنہ ہندوستانیوں کو ٹگور کی شخصیت کی خبر بھی نہ ہوتی۔

طرفہ محشرے دارد از فریب فردائے
زندہ زیرِ پیرہن مُردہ در کفن تنہا

فریب فردا نے زندہ و مردہ دونوں کو انتظار حشر میں مبتلا کر رکھا ہے کوئی امید فردا کا منتظر ہے کسی کو اندیشہ فردا دامنگیر ہے۔ کوئی اپنے حسنِ عمل کی جزا کا امیدوار ہے کسی کو بداعمالیوں کا کھٹکا لگا ہوا ہے مگر نہ معلوم پس پردہ کچھ ہے بھی یا نہیں۔ اس کی حقیقت فردائے حشر سے پہلے کھلی ہے نہ کھلے گی مگر ہر کس بخیال خویش خبطے دارد۔

'وعدہ فردا' کا مضمون ایسا عام ہے کہ قریباً ہر شاعر کے دیوان میں سینکڑوں اشعار نظر آئیں گے مگر اس شعر میں مصنف کے زور بیان نے وہ دل آویزی پیدا کر دی ہے کہ اگلے اساتذہ کے سینکڑوں اشعار سامنے لائے جائیں تو بھی یہ شعر اپنے مُنہ سے آپ بولتا نظر آئے گا بات یہ ہے کہ قوت متخیلہ فقط مضامین ہی پر تصرف نہیں کرتی بلکہ الفاظ پر تصرف کرتی ہے۔ صدیوں کی مشہور و معروف معلومات پر تصرف کر کے تازہ مجموعہ تیار کرتی ہے اور اچھوتے نتائج نکالتی ہے۔ اس شعر میں 'زندہ زیر پیراہن' اور 'مردہ در کفن تنہا' کے تقابل اور پھر 'تنہا' کے مقابلہ میں 'طرفہ محشرے' کی بلاغت آفرینی سے ذہن کے سامنے بجلی سی کوندنے لگتی ہے۔ اس تقابل کی سحر کاری نے کلام کو تازگی وجدت کا لباس پہنا دیا ہے ×

ایکہ کارہا کردی مدفنے مہیا کن
تا بہ کے نہان دارد عیب من کفن تنہا

شعر پڑھتے ہی دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے۔ "کارہا کردی" کی بلاغت ذہن کے سامنے محشرستان معانی کا اجمالی نظارہ پیش کر دیتی ہے۔ دوسرے مصرع میں خصوصاً "عیب من کفن تنہا" میں کس قیامت کا درد بھرا ہوا ہے۔ ہندوستانیوں کی بدمذاقیوں کا شکوہ کہاں تک ہاں اگر اساتذہ عجم میں سے کسی کے قلم سے یہ شعر نکل جاتا تو نہ معلوم اہل عجم کتنا ناز کرتے۔

چارۂ پشیمانی خوش دلی و خوش کامی
توبہ از ریاکاران خندہا زمن تنہا

اہل مغرب کی زندگی کا دستور العمل عموماً اسی فلسفہ پر ہے کہ جذبۂ پشیمانی کا بہترین علاج خوش دلی و خوش کامی ہے (Eat, drink & be merry) کے اصول پر کھاتے پیتے ہنستے کھیلتے زندگی بسر کرنا چاہئے۔ عمر خیام کی شاعری بھی زندگی کے اسی دستور العمل کی حامی ہے اسی وجہ سے یوروپ میں عمر خیام کی شاعری مقبول خاص و عام ہے۔ افسوس ہے کہ مصنف نے بھی اس شعر میں اپنے اصول زندگی کے خلاف اہل مغرب کے دستور العمل کی تائید کی ہے یعنی اُٹھتے بیٹھتے توبہ و استغفار کی بھرمار ریاکاروں کا شیوہ ہے یہ توبہ بے معنی ریاکاروں ہی کو مبارک۔ چند روزہ زندگی کو ہنستے کھیلتے گزار دینا اور کلفتِ پشیمانی کو ہنسی

ہنسی میں اُڑا دینا چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ مکافات عمل کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا چاہئے مگر فی الحقیقت یہ کوئی فلسفہ نہیں ہے بلکہ دل کو جھوٹی تسلّی دینا ہے مصنف کا طرز زندگی اُس کے اس شعر کی کبھی تائید نہیں کر سکتا۔ یہاں یہ بتا دینا ضرور ہے کہ شاعر کبھی آپ بیتی کہتا ہے کبھی جگ بیتی۔ اُس کے بعض اشعار خود اُس کی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں اور بعض اشعار دوسروں کی زندگی کا۔ شاعر کا ہر شعر خاص اُسی کی زندگی کا مظہر نہیں ہوتا بلکہ اوروں کے معتقدات و معمولات کو بھی قلمبند کر دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف پر کوئی خاص وقت ایسا بھی گزرا ہو جب وہ اہل مغرب یا عمر خیام کے اس فلسفۂ زندگی سے متاثر ہوا ہے ورنہ مرزا صاحب کے طرز زندگی پر غور کی جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ مکافات عمل سے چشم پوشی کرنا اور خندہ بیجا سے دل کو جھوٹی تسلی دینا اُن کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ انسان کا ملامت شعار ضمیر ایسے خندۂ ناروا کی اجازت نہیں دے سکتا۔ جذبۂ پشیمانی ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہنسی میں اُڑا دینا اہل بصیرت سے ناممکن ہے چنانچہ مرزا صاحب کا ایک اور شعر

سہو و خطا ودیعتِ فطرت سہی مگر
سمجھاؤں کیا ضمیر ملامت شعار کو

اس بات کی روشن دلیل ہے کہ وہ عمر خیام کے مشہور فلسفہ (یعنی مکافات عمل سے چشم پوشی کرنا اور جذبۂ پشیمانی کو ہنسی میں اُڑا دینا) کے قائل نہیں نہ اسے اپنی زندگی کا دستور العمل بنایا۔ مرزا صاحب کے کلام پر تفصیلی نظر ڈالنے سے

یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ اُن کے عقائد جبریہ فرقے سے ملتے جلتے ہیں وہ انسان کو فاعل مختار نہیں مانتے۔ اس کی مثالیں اُن کے کلام میں کثرت سے پائی جاتی ہیں مگر اس حقیقت امر کو تسلیم کرنے کے بعد بھی (یعنی انسان مجبور ہے مختار نہیں) ایک دوسری حقیقتِ نفسی یعنے ضمیر ملامت شعار کی خلش انسان کو بے چین رکھتی ہے۔ سہو و خطا کو ودیعتِ فطرت مان لینے پر بھی انسان کا ضمیر ملامت کرتا رہتا ہے۔ جب یہ حالت ہے، تو چارۂ پشیمانی معلوم ؟ مقصد اس تمام تقریر کا یہ ہے کہ مصنف کا یہ شعر محض اُس کی وقتی ذہینت کی ترجمانی کرتا ہے اُس کے مقررہ طرز زندگی اُس کے معتقدات راسخہ کا مظہر نہیں ہے۔

رہبرانِ خودگم را جز دعا چہ فرمایم
پا شکستہ و حیران ماندہ در وطن تنہا

ترک موالات کا طوفان بے تمیزی اور لیڈران خودگم کی ہنگامہ آرائی ابھی کل کی بات ہے۔ گمراہ لیڈروں کے فریب میں آکر ہزاروں نا عاقبت اندیش منچلے ہندوستان سے ہجرت کرکے افغانستان۔ ترکستان اور ایران کی طرف سر بصحرا ہوگئے۔ بعض تو ایسے احمق تھے کہ اپنے گھروں میں آگ لگا کر اپنی بیویوں کو طلاق دے کر نکل کھڑے ہوئے۔ رہبران خودگم نے علی الرغم برطانیہ ان سب حماقتوں کا وبال اپنے سر لیا۔ اُس وقت جن مصلحت اندیش بہی خواہان وطن نے ان لیڈروں کے خلاف کچھ آواز بلند کی تو اُن پر اُلٹی لے دے ہونے لگی بھلا اُس نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا۔ غالباً انہیں واقعات و حوادث سے

متاثر ہو کر شاعر کے دل سے یہ دردانگیز صدا بلند ہوئی ہے۔ جز دُعا چہ فرمایم کے
لفظ سے لیڈروں کا ادب بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مگر اس طنز آمیز بلاغت (جز دُعا
چہ فرمایم) میں وہ زہر بھرا ہے جس کے سامنے ملامت کے ووٹ کچھ اثر نہیں
رکھتے

ناخدا از من بگزر سوئے دیگراں بنگر

کار من بہ دریا در دست و پا زدن تنہا

فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ اللہ اللہ وہی شاعر جو چشم ظاہر بین میں
بوریائے فقر پر ایک حقیر و تلخ زندگی بسر کرتا ہے فی الحقیقت کتنی زبردست
طاقت کا سرچشمہ ہے۔ یہ شعر ہے جس میں مرزا یگانہ کے صحیح کیرکٹر، انکی شان
خودداری و خوداعتمادی۔ اُن کے جذبہ ایثار و ہمدردی۔ حریت و آزادی کا مطالعہ
کرکے انسان اپنی اصلاح کرنا اور پستی سے بلندی کی طرف پرواز کرنا چاہے تو
کرسکتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ناخدا میرے پاس سے ہٹ جا دوسروں کی خبر لے
میرا ساتھ چھوڑ دے میں تن تنہا دریا کے موج و گرداب میں ہاتھ پاؤں مارتا
ہوا پار ہو جاؤں گا۔ سبحان اللہ کیا شان بے نیازی و خودداری ہے جسکو اپنے
اوپر اتنا بھروسا ہو جو ایسے نازک وقت میں بھی غیروں کے سہارے کو ننگِ
ہمت جانتا ہو اُس کی عالی ہمتی و بلند حوصلگی کا کیا پوچھنا۔ سوئے دیگران بنگر،
دوسروں کی خبر لے۔ دوسروں کی مدد کر میری کوئی پروا نہ کر۔ جذبہ ایثار و ہمدردی
کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ حضرت مرزا صاحب کی اصولی و عملی

زندگی کو اس شعر کی روشنی میں دیکھو گے تو قول و فعل میں ایک نقطہ کا بھی فرق نظر نہ آئے گا۔

یہی وہ شاعری ہے جو ملک و ملت۔ تمدن و تہذیب پر گہرا اثر ڈالتی اور سرمایہ ناز ثابت ہوتی ہے جس کا صحیح مطالعہ کیا جائے اور عملی سبق لیا جائے تو فقط شخصی زندگی میں نہیں بلکہ اجتماعی زندگی میں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے مگر افسوس ہے کہ ہندوستان بلکہ ساری مشرقی اقوام میں اس قسم کی ولولہ انگیز مصلحانہ شاعری کے مطالعۂ صحیح کی قوت ہی نہیں پائی جاتی۔ اگر مطالعہ صحیح کی توفیق ہو تو جذبۂ غیرت و خودداری کی تحریک ہماری رفتار ارتقا میں نہ جانے کتنی سرعت پیدا کر دے۔ یہی اشعار ہیں جن کے مطالعہ سے بقول پروفیسر منیر ہمارا مردہ خون جوش مارنے لگتا ہے۔ ہمارا سینہ امیدوں کی جولانگاہ بن جاتا ہے۔ ہماری سُست زندگی میں ایک نئی موج حیات دوڑ جاتی ہے۔ زندہ و بیدار قوموں کی اجتماعی زندگی میں جو روح افزا انقلاب نمایاں ہوتا ہے وہ کیوں؟ اس کا سبب یہی ہے کہ کثیف مادی زندگی جب دلوں کو افسردہ و مردہ بنا دیتی ہے تو شاعر کے ایسے ہی ہمت افزا نغمے

ناخدا از من بگزر سوے دیگراں بنگر

کار من بدریا در دست و بازوئے تنہا

حرارت پہنچا کر حقیقی انسانی زندگی کی لہر دوڑا دیتے ہیں۔ عناصر سُست بیدار ہو کر جذبۂ انسانیت کو برقرار رکھنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ قوم کی غیرت مند و متحرک ہستیاں اپنی کھوئی عظمت و قوت کو دوبارہ حاصل کرنے پر آمادہ ہو جاتی

ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کا سہارا ڈھونڈنے دوسروں کی تقلید کرنے کی کہنہ و فرسودہ رسوم کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ نام نہاد مذہبی قیود اٹھا دی جاتی ہیں۔ مساواتِ انسانی از سرِ نو زندہ ہو جاتی ہے۔ حُریت فکر اپنے حسن جہان افروز کا پرتو ڈالتی ہے اور انسان اپنے فطرت کے پاکیزہ جوہرِ خودداری کی آب و تاب دیکھ کر پھر ایک بار سکون و اطمینان کی سانس لیتا ہے۔ شاعر کی ذات وہ آفتاب عالمتاب ہے جو انسانیت کی حس کو بیدار کر کے مرگ معنوی کو حیات ابدی سے بدل دیتا ہے۔ آفتاب بہار تو اپنی نورانی شعاعوں سے کائنات کے ذرے ذرے میں روح حیات پھونک کر رخصت ہو جاتا ہے۔ فصل بہار اپنی طلعت درخشاں کے جلوے دکھا کر روپوش ہو جاتی ہے۔ روز و شب۔ ماہ و سال ہوا کی طرح گزر جاتے ہیں۔ موسمی تغیرات یکے بعد دیگرے اپنے اپنے کرشمے دکھا کر چلے جاتے ہیں لیکن اس تمام عرصہ میں نشو و نما کی وہ قوت جو آفتاب نے ذرّے ذرّے میں پہنچا دی تھی اپنا کام کرتی رہتی ہے حتیٰ کہ لاکھوں منازل ارتقا طے کرنے کے بعد مادرِ گیتی جب چادرِ مرگ اوڑھنے لگتی ہے تو پھر آفتاب بہار اپنے چہرہ جان نواز سے نقاب اٹھا کر زندگی کی حرارت پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح شاعر آتا ہے اور اپنے نغمہ جان نواز سے فضائے دہر کو معمور کر کے چلا جاتا ہے جینے۔ سال اور صدیاں گزر جاتی ہیں۔ تاریخ اپنے ورق الٹتی رہتی ہے۔ انسانی نسلیں یکے بعد دیگرے پردہ دنیا پر اپنے اپنے تماشے دکھا کر پیدا اور ناپید ہوتی رہتی ہیں۔ تغیرات و انقلابات کا سلسلہ نامتناہی گاہے چناں گاہے چنیں رنگ دکھاتا رہتا ہے مگر شاعر کا نغمہ اسی طرح فضائے عالم پر مسلط رہتا اور چپ چاپ اپنا کام کئے جاتا ہے۔

اس مقام پر شاعر کو آفتاب بہار پر قیاس کرنا ہماری کوتاہ نظری ہوگی. شاعر ایک جاودانی آفتاب ہے جو ہمیشہ ہمیشہ نورافشانی کرتا رہتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شاعر ایک ایسی زبردست طاقت کا سرچشمہ ہے جو بنی نوع انسان میں زندگی کی روح پھونکتا رہتا ہے۔

بقول پروفیسر منیر کسی ملک وملّت کی حقیقی قوت کا معیار اُس کے ظاہری اسباب اور مادی ساز وسامان نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ اگر آج موجود ہیں تو کل معدوم آج نہیں ہیں تو کل پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ اصلی طاقت تو وہ خزانہ ہے جو افراد قوم کے سینوں میں محفوظ رہتا ہے جس پر کوئی چھاپہ نہیں مار سکتا۔ حقیقی دولت تو فلاسفر اور شاعر کے وہ نتائج افکار ہیں جو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے رہتے ہیں اور اُن کی اصولی وعملی زندگی کو شاہراہ ارتقا کی طرف لیجاتے ہیں۔ اس شاہراہ تک رسائی کا ذریعہ شعر۔ فلسفہ اور تاریخ ہے مگر شعر کی طاقت سب پر بالا ہے۔ پروفیسر مذکور نے کیا پتے کی بات کہی ہے کہ فردوسی قریباً ایک ہزار سال سے زیر خاک سو رہا ہے۔ لیکن آج بھی ایران اپنی پچاس فیصدی قوت اُسی کے نغموں سے حاصل کر رہا ہے۔ ہومر اور کالی داس کو اس دار فانی سے کوچ کئے زمانہ گزر گیا۔ لیکن اُن کے اشعار ایک عالم کے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ سعدی و رومی قریباً سات سو سال سے نقاب مرگ اپنے چہرے پر ڈالے ہوئے ہیں مگر زمانہ اُن کی پرستش کر رہا ہے۔ غالب نصف صدی سے زائد عرصہ ہوا خاک کا پیوند ہو چکا مگر اب اُس کا فلسفہ ملک کو بیدار کرنے لگا ہے۔ کل کی بات ہے۔ کہ مولانا اکبر الہ آبادی زندہ تھے۔ اُن کی مصلحانہ وناصحانہ ظرافت اور اُنکا فلسفہ

اُن کی زندگی ہی میں بہت کچھ مقبول خاص وعام ہوگیا اور آیندہ بھی افراد قوم کے دلوں کو گرماتا رہے گا۔ چونکہ اکبر مرحوم کی شاعری کا اکثر حصہ واقعات حاضرہ سے متعلق ہوتا تھا اور واقعات حاضرہ یوماً فیوماً بدلتے رہتے ہیں اس وجہ سے امتداد زمانہ کے ساتھ اُس وقت کے واقعات کی دلچسپی واہمیت میں قدرتی طور پر کمی ہوتی جائے گی مگر پھر بھی اُن کا خالص فلسفہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

حضرت مرزا یگانہ کا موضوع سخن فلسفہ نفسیات ووجدانیات سے متعلق ہے اس وجہ سے ہر زمانے اور ہر دور میں زندہ رہنے والی چیز ہے۔ چونکہ آپکا موضوع شاعری کسی خاص زمانے کسی خاص قوم تک محدود نہیں ہے بلکہ نہایت وسیع اور عالمگیر ہے اور انداز بیان میں انتہا کی کشش۔ ندرت۔ اور پختہ کاری ہے اس وجہ سے اُس کی فنا ممکن نہیں بلکہ یہ نغمہ جان نواز ہر دور میں قوم کی ذہینت اور ملک کے تمدن وتہذیب پر مصلحانہ اثر ڈالتا رہے گا۔ آپ کے کلام میں ایک زبردست انقلابی طاقت موجود ہے مگر چونکہ ابھی تک اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں نہیں ہوسکا ہے اور ملک میں صحیح قوت مطالعہ پیدا نہیں ہوئی ہے اس وجہ سے اس کی اہمیت کا عام طور پر اندازہ نہیں ہوسکا اس کے لئے کافی وسعت زمانی درکار ہے کیونکہ ہر شے کی نشوونما اپنے خاص وقت اور مناسب ماحول میں ہوتی ہے۔ آثار نہایت امید افزا ہیں۔ مرزا صاحب کے آیات وجدانی اور سوانح زندگی جن اہل نظر تک پہنچ چکے ہیں وہ دل ہی دل میں آپ کی دماغی واخلاقی قوتوں کے قائل ہو چکے ہیں مگر عام طور پر ملک وملت کی طرف سے مرزا صاحب کی شخصیت کا اعتراف صحیح کب ہوسکے گا اسکے متعلق

پیشین گوئی تو کی جاسکتی ہے تعیّن وقت نہیں کیا جاسکتا۔

شعر مذکور الصدر میں مصنف نے اپنے جذبہ غیرت وخودداری کی ترجمانی میں جو کمال دکھایا ہے اس کی حقیقی قدر وقیمت کا اندازہ کرنے کے لئے اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ آپ کے طرز زندگی کا مطالعہ کیا جائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعر نے اپنے جذبہ خودداری کا احترام کس حد تک ملحوظ رکھا ہے۔ آیا شاعر کا یہ قال مطابق حال بھی ہے یا نہیں۔ شاعر کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے گا۔ تو اس سوال کا جواب اثبات کے سوا نفی میں دینے کی جرأت نہ ہوگی۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مرزا صاحب کے انداز سخنوری وحریت پسندی نے آپ کو کم از کم باخبر تعلیم یافتہ طبقوں کی نگاہوں پر چڑھا دیا ہے اور باوجود عدم مساعدت وقت دکشمکش روزگار آپ کی شخصیت اور آپ کا کمال سخنوری ملک کی ذہینت پر خاموش اثر ڈال رہا ہے۔

جذبہ غیرت وخودداری کے سلسلہ میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دور حاضر میں فلسفہ خودی کے واحد علم بردار ڈاکٹر سر محمد اقبال بالقابہ سمجھے جاتے ہیں۔ مگر بالغ نظروں کو اس حقیقت کا اندازہ بھی ضرور ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے فلسفہ خودی کی جو تعلیم دی ہے وہ محض نظری حیثیت رکھتی ہے اس اعتبار سے اُنکی مثنوی اسرار خودی ہمارے علم ادب کے لئے مایہ ناز ہے۔ مگر حضرت مرزا یگانہ نے فلسفہ خودی وخودداری کی محض نظری تعلیم نہیں دی ہے بلکہ عملی بھی جس کی شہادت محض آپ کے کلام ہی تک محدود نہیں ہے آپکی عملی زندگی سے بھی اس بات کا ثبوت قدم قدم پر ملتا ہے۔ مرزا صاحب کا احساس

خودی وشیوہ خودداری خارجی موثرات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اندرونی و داخلی حیثیت رکھتا ہے اس بنا پر آپ کی تعلیم خودی و خودداری عملی پہلو سے بھی پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے۔ مگر ڈاکٹر اقبال کا فلسفہ خودی خارجی موثرات یعنی مطالعہ کتب و اکتساب علمی کا نتیجہ ہے اس بنا پر آپ کی تعلیم خودی نظری حیثیت رکھتی ہے اور دونوں حیثیتوں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی زندگی ایسی نہیں گزری جس سے جذبۂ خودی خودداری عملی صورت اختیار کر لیتا ہے برخلاف اس کے مرزا صاحب کو زندگی میں قدم قدم پر امتحان علونفس کا موقع ملتا رہا ہے اور علونفس کا امتحان تلخیِ مصائب ہی میں ہوسکتا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب موصوف کو بھی تلخ و پر آشوب زندگی بسر کرنے کا موقع ملتا اگر وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ سالہا سال تک مصیبت کے پہاڑ کاٹتے فاقہ کشی و پریشان روزگاری و پراگندہ خاطری کی لذت اُٹھاتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ امتحان علونفس میں کامیاب نہ ہوتے اور اُن کی تعلیمِ خودی نظری حیثیت سے عملی صورت نہ اختیار کر لیتی۔

صد رفیق و صد ہمدم پرشکستہ و دلتنگ
داور انمی زیبد بال و پر بہ من تنہا

میں پہلے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ سخنور علی الاطلاق اک مجسمہ ہے۔ درد محبت۔ جذبہ حرّیت اور شرف انسانیت کا۔ ہمدردی و محبت کے جذبے اور اپنے خلقی سوز و گداز سے مغلوب ہو کر انسان کیا حیوان کیا خدا کی

ہر مخلوق پر محبت کی نظر ڈالتا ہے۔ دیکھو اس شعر میں جذبہ محبت و ہمدردی کی کتنے پرجوش الفاظ میں ترجمانی کی گئی ہے۔ بندگانِ دنیا کا تو یہ حال ہے کہ وہ اپنی نفسانیت و خود غرضی کی دُھن میں خلق خدا کو کچل ڈالنے یا اپنا بندہ بنا لینے پر تلے رہتے ہیں مگر شاعر وہ مقدس ہستی ہے جو دوسروں کی حالت زار دیکھ کر کانپ اُٹھتا ہے۔ انسان تو اُس کا ہمجنس ہے وہ دیگر مخلوق کو بھی مصیبت میں مبتلا دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا پھر ایسا دردمند دل اپنے رفیقوں اپنے دوستوں کو کن آنکھوں سے بیدست و پا دیکھ سکتا ہے۔ دوستوں کو مجبور اور بے بس دیکھ کر بارگاہ ایزدی سے خطاب کرتا ہے کہ

داورا نے زیبد بال و پر بہ من تنہا

سبحان اللہ کتنا پاک اور شریفانہ جذبہ ہے۔ جناب احدیث میں عرض کرتا ہے کہ میں کن آنکھوں سے دوسروں کو پرشکستہ و دل تنگ دیکھوں اور خود آزادی کے مزے اُٹھاؤں۔ اس التجا سے دو معنے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ تو نے جس طرح مجھے بال و پر کرامت فرمائے ہیں میرے رفیقوں کو بھی عطا کر اگر یہ نہیں ہو سکتا تو میرے بال و پر بھی چھین لے مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ میں خود آزاد رہوں اور دوسرے مجبور و شکستہ حال۔ یہ وہ جذبہ شرافت ہے جو فقط شاعر اور اُس کی قوم ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیائے انسانیت کے لئے مایہ افتخار بنا رہے گا۔ اللہ اللہ ہمدردی و اخوت کی ایسی دل ہلا دینے والی صداؤں سے بھی مردہ دل ہندوستانی مرگ معنوی کے خواب سے بیدار نہیں ہوتے۔ زندہ قومیں اگر یہ صدائیں سن پائیں تو ایک سرے سے

دوسرے سرے تک انقلاب پیدا ہو جائے۔ یادش بخیر سر رابندر ناتھ ٹگور نے اپنے زور قلم سے دنیا کو فتح کر لیا اور شوق عبودیت کا ایسا ترانہ چھیڑا کہ فضائے عالم میں دھوم مچ گئی مگر تجزیہ و تحلیل کے بعد غور سے دیکھو تو اُن کی شاعری کی مایہ و بضاعت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسان ایک ایسی ہستی کے سامنے (جو حد تصور سے بھی وراء الورا ہے) سر عقیدت جھکائے کھڑا ہے۔ اُس کے حُسن مطلق کو جو حس و ادراک سے بالاتر ہے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہے ظاہر ہے کہ انسان اس پیکر خاکی کے ساتھ ٹگور کے منتہائے نظر تک پہنچ ہی نہیں سکتا اس لئے اُن کی شاعری محض Ideal ہے اور کچھ نہیں۔

غایت آفرینش یہ نہیں ہے کہ انسان ایک ماوراے خیال ہستی کا تصور باندھے بیٹھا رہے بلکہ یہ مقصد ہے کہ انسان اپنے جذبہ اخوت و ہمدردی سے دنیا کے تمدن و تہذیب کو خوشگوار بنائے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ انسان خدا کی ہستی کو دھیان ہی میں نہ لائے بلکہ میرا مدعا یہ ہے کہ شاعر کو اپنے قول و فعل سے وہ سبق دینا چاہئے جو عملی زندگی میں اصلاح و اعتدال پیدا کر کے تمدن کو ترقی دے سکے۔ اور یہ سبق اخوت و ہمدردی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

"شاعر کائنات کو ذرا زیادہ غور سے دیکھتا ہے تو اُسے ایک اور ہی عالم نظر آتا ہے وہ ہر شے میں وابستگی پاتا ہے۔ ایک برقی لہر ہے جو ایک چیز سے دوسری چیز میں سرایت کر رہی ہے۔ پہاڑوں کی بلند چوٹیاں آسمان کے چہرے

کہ جھوم رہی ہیں ہوا کے جھونکے فضا میں ایک دوسرے سے لپٹ رہے ہیں۔ موجیں پانی میں ہم آغوش ہو رہی ہیں۔ درختوں کی شاخیں آپس میں معانقہ کر رہی ہیں۔ سبز پتیاں پھولوں کو سینے سے لگا رہی ہیں۔ آب رواں عروس سبزہ سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ پھر انسان کی بستیوں میں آنکھ کھولتا ہے تو یہی قانون جذب وکشش کار فرما نظر آتا ہے۔ مرد ہیں عورتیں ہیں بچے ہیں۔ باپ بیٹے کی محبت ماں بیٹی کی محبت۔ خویش واقارب جنہیں خون نے ایک رشتے میں منسلک کر دیا ہے۔ پھر قوم ہے۔ ملک ہے اور مشترک سود وزیاں ہے۔ غرض جدھر دیکھتا ہے اتحاد ووابستگی کا عالم نظر آتا ہے۔ اسی اتحاد و محبت پر نوع انسان کی زندگی کا دار ومدار ہے۔ اُنس وہمدردی۔ آپس کے میل جول پر کارخانہ زندگی چل رہا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف واردات قلبی وکیفیات نفسانی اُس کے سامنے آتی ہیں جو اُسی میل جول اور باہمی تعلق کا نتیجہ ہوتی ہیں جس کے باعث کاروان حیات اپنی منزلیں طے کر رہا ہے۔ پھر آگے چل کر قدرت کے کارخانے پر اک اور غائر نظر ڈالتا ہے تو اُسے خود انسان اور عالم قدرت میں یگانگی واتحاد کا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ تمام مظاہر قدرت انسانی عشق ومحبت کی لطافتوں کے لئے آرائش کا کام دیتے ہیں ان تمام مشاہدات سے شاعر کے دل پر گوناگون کیفیات طاری ہوتی ہیں آخر کار یہی کیفیتیں پردۂ دل سے نوائے درد بنکر باہر نکل آتی ہیں اور اسی کا نام شعر ہے گویا شعر نوائے درد ہے۔

درد محبت انسان کی سرشت ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ انسان اُنس ہمدردی اخوت ومروت کے اصولوں پر کاربند ہو کر چندروزہ حیات مادی کو چین سے گزا

دیتا مگر ہائے افسوس ایسا نہ ہوا۔ اجتماعی زندگی کی کشاکش اور مادی تمدن کی نام نہاد ترقی نے حیات انسانی کو تصنّعات و تکلفات سے آلودہ کر دیا اور وہ سادہ و پاکیزہ زندگی جو انسانیت کی جان تھی آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگی۔ عشق و محبت کی زندگی کے تمام لوازم یعنی اخوت۔ مروت۔ صداقت۔ شجاعت جمیت غیرت ایک ایک کر کے انسانی بستیوں سے کنارہ کر گئے اور اُن کی جگہ تمام رذائل اخلاق نے ڈیرے ڈال دیئے۔ انسان مادیت کی کثافتوں میں آلودہ ہو کر رہ گیا اور مختلف انواع کی غلامیوں نے اُسے زنجیروں میں جکڑ لیا کہیں وہ اجتماعی رسوم کا پابند ہے کہیں مذہبی وضعداریوں میں مقید ہے کہیں سیاسی غلامی کا طوق اُس کے گلے کا ہار ہو رہا ہے کہیں وہ اپنی حُریت فکر کو جواب دیکر ذہنی تقلید ذہنی غلامی کے تاریک زندان میں اپنی عمر کے دن گنوا رہا ہے۔
ان عبرت ناک مناظر کو دیکھ کر ساکنان عالم بالا کی غیرت حرکت میں آتی ہے۔ ناگہاں شاعر کے آسمانی نغمے فضائے عالم پر مسلط ہو جاتے ہیں شاعر اپنی پاکیزہ فطرت میں حسن حقیقی کی روشنی لے کر آتا ہے اور اس نور سے انسانی زندگی کی تاریکیوں کو دور کرتا ہے۔

مادی کثافتوں کی گوناگوں نوعیت کے باعث اُس کا نغمہ بھی مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔ کبھی بادل کی طرح گرجتا ہے کبھی ابر رحمت بن کر برستا ہے کبھی بجلی کی طرح چمکتا ہے۔ کبھی اس میں پھولوں کا تبسم ہے کبھی شبنم کی اشک باری کبھی طوفانی سمندروں کا شور ہے کبھی دھارے کا زور کبھی کوہ آتش فشاں کیطرح پھٹتا ہے کبھی زلزلے کی طرح دل ہلا دیتا ہے کبھی ماہتاب صفت سکون و مسرت

کا مژدہ سُناتا ہے کبھی آفتاب صفت بیداری کا پیغام لاتا ہے۔ غرض اُسکے تمام نغمہائے رنگا رنگ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان کو حیات حقیقی کے جمالِ جہان آرا کا مشاہدہ کرائے اُس کی حقیقی بزرگی و عظمت کا دلوں پر نقش بٹھادے اور پست مادی زندگی کی کثافتوں سے آزاد کر کے اُس نورانی حقیقت سے ہم آغوش کردے جو انسانی فطرت کا جوہر ہے۔ اسی سرودِ حقیقی کا نام شعر ہے یا یوں سمجھو کہ شاعر حسن و عشق۔ محبت و ہمدردی۔ حریت و آزادی کے گیت گاتا ہے وہ خود آزاد رہنا اور دوسروں کو آزاد دیکھنا چاہتا ہے دیکھو اور پھر دیکھو کہ شاعر کیا کہتا ہے ؎

صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ
داورا نمے زیبد بال و پر بہ من تنہا

یاد ایامے کہ سلطنت مغلیہ کے دامن تربیت میں عرفی و نظیری جیسے بیسیوں سخنوروں نے نشو و نما پائی اور حسب لیاقت سرافراز ہوئے۔ مرزا غالب کی نشو و نما اگرچہ گہوارۂ تنزل میں ہوئی تھی سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ بلکہ اُن کے دیکھتے دیکھتے ہی گل ہو گیا پھر بھی اُس وقت تک اہل کمال کے قدر شناس و مربی ایسے مفقود نہ تھے جیسے اب۔ مگر وائے برحال مرزا یگانہ کے۔ وہ ایسے وقت میں تشریف لائے کہ اُن کی قوم کی حکومت خواب فراموش ہو چکی۔ حکومت تو حکومت قومیت کا شیرازہ بھی بکھر چکا۔ برطانوی حکومت سے فارسی اُردو زبان کی حمایت و قدر افزائی کی توقع فضول۔ پھر ایسی حالت میں اردو فارسی کے سخنوران ذی کمال کی دماغی استعداد کا پرکھنے والا اور اُن کا حوصلہ بڑھانیوالا

کہاں سے آئے۔ اگر یہی مرزا یگانہ یوروپ میں ہوتے تو غیر ممکن تھا کہ وہاں کی زندہ قومیں آپ کے آیات وجدانی اور کمال سخنوری کی طرف سے چشم پوشی کرتیں۔ سالہا سال سے ذلیل و تلخ زندگی بسر کرنا آئے دن کی مصیبت و فاقہ کشی اور بال بچوں کی نادیدنی حالت فقط مرزا صاحب ہی کے لئے سوہان روح نہیں ہے بلکہ اس مایہ ناز ہستی کی ناگفتہ بہ حالتیں خود ہندوستان کے لئے باعث توہین ہیں۔ قومی توہین کا یہ دردناک نظارہ عجب نہیں کہ بعض غیرت مندوں کو یہ دعا کرنے پر مجبور کرے کہ کاش اب مرزا صاحب کی حیات چندروزہ حیات جاودانی سے بدل جائے جلد سے جلد اُن کا خاتمہ بالخیر ہو جائے اور اس شرمناک قومی ٹریجڈی پر

حضور نظام

اور

مہاراجہ صاحب محمود آباد

کی خدمت میں مبارکباد کا تار بھیج دیا جائے۔

کیونکہ ہندوستان کے مسلمان والیان ملک اور روساء محترم میں یہ دو شخصیتیں نہایت بیدار مغز اور اپنے قومی و اخلاقی سے فرائض سے آگاہ ہیں۔ ایسے روساء کے عہد میں ایسی ٹریجڈی کا وقوع ہندوستان کی ادبی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اس سلسلہ میں ہز ہائنس جناب نواب صاحب رامپور کا نام لینا بے سود معلوم ہوتا ہے کیونکہ بندگان علم ادب کا درد اُنہیں کیوں ہونے

لگا۔ افسوس ہے کہ ہندوستان کی وہ ہستی جو سرزمین ایران کے لئے بھی مایہ ناز کہی جاتی تو بے جا نہ تھا ہندوستان کی مجرمانہ و بیدردانہ غفلتوں سے یوں تباہی و ہلاکت کے قریب پہنچ گئی۔ نہ جانے ہندوستان کی غیرت و حمیت کو کیا ہوا۔ ملک کے ایک نامور فرزند سر تیج بہادر سپرو کو ایک بار بس اتنا خیال پیدا ہوا تھا کہ وہ مرزا صاحب کا کلام پروفیسر براؤن کی خدمت میں خود اپنی معرفت بھیج دیں تاکہ پروفیسر صاحب (جواب مرحوم ہو گئے) کے سلسلہ تالیفات میں شامل ہو کر یورپ میں روشناس ہو سکے۔ مگر بڑے آدمیوں کی بڑی بات۔ سر تیج بہادر کو پھر اُس کا خیال بھی نہ آیا بھول بھال گئے اور اب تو پروفیسر براؤن بھی چل بسے۔

نکتہ دانِ خودسازم میرزا یگانہ را
دل نمے توان برداشت لذت سخن تنہا

خدا بخشے مرزا غالب نے بھی عالم کس مپرسی میں یہ کہا تھا ؎

بیا ورید گر ایں جا بود زباندانے ۔۔۔ غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

غالب نے تو پھر بھی نسبتاً بہتر زمانہ پایا تھا کھانے کو روٹیاں بھی مل جاتی تھیں اور پینے کو شرابیں بھی۔ مگر مرزا یگانہ کی زندگی تو ایسی گزری اور گزر رہی ہے کہ الٰہی توبہ۔ شراب و کباب کے مزے سے تو آشنا ہی نہ ہوئے باقی رہی روٹی سو وہ بھی ایک وقت ملی تو دوسرے وقت فاقہ خاک ہے اس زندگانی دنیا اور اس زمانہ سفلہ پرست پر۔ کہ گدھے تو خشکے کھائیں اور اہل ہنر کو روٹیوں کے لالے پڑ جائیں۔ بھلا ایسے ملک میں ان آیات وجدانی کی داد

کون رہے۔ اسی وجہ سے مصنف نے اپنا مخاطب صحیح خود اپنے تئیں ٹھہرایا ہے۔
خواجہ آتش رح کا یہ شعر مرزا صاحب کے کس قدر حسب حال ہے ؎

سمجھتا کوئی تو اس اندھی نگری میں زبان میری
الٰہی کاش میں پیدا ہوا ہوتا گنواروں میں

ہنوز زندگی تلخ کا مزہ نہ ملا
کمال صبر ملا صبر آزمانہ ملا

مرزا صاحب کی زندگی جیسی تلخ گزری اُس کی مثال اگلے زمانے میں میر تقی میر اور خواجہ آتش رح کی زندگی سے ملتی ہے۔ یوں تو عموماً شعراء کا طبقہ فقر وفاقہ میں بسر کرتا رہا ہے مگر مصیبت میں اپنی خودداری کو نباہ دینے والے بس ڈھاک کے تین پات نظر آئیں گے۔ ایسی تلخ زندگی بسر کرنے پر بھی شاعر کو زمانے سے جو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ اُس کے اندازہ صبر کے مطابق کوئی صبر آزمانہ ملا اور نہ اُس کے صبر کے جوہر اور کھلتے۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ مرزا صاحب نے اپنے اہل وعیال کی ذمہ داریوں کے ساتھ بچوں کی حالت زار کا تماشا دیکھتے ہوئے دکھے ہوئے دل پر پتھر رکھ کر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے آنسو پی کر اپنی شان خودداری قائم رکھی ہے۔ حضور قلب اور تصور صادق کے ساتھ دیکھو تو اس شان خودداری پر روح شرافت و مردانگی وجد میں آجائے۔ ذرا انصاف تو کرو کیا میر تقی میر۔ خواجہ آتش اور اور مرزا غالب کے ساتھ بھی ایسے جھنجھٹے تھے۔ کیا کوئی تذکرہ کوئی تاریخ اس بات کا ثبوت دے سکتی ہے کہ خواجہ آتش اور میر تقی میر نے اس بیکسی اس کس مپرسی

ہیں ان ذمہ داریوں کے ساتھ شان خودداری برقرار رکھی ہرگز نہیں وہ زمانہ ایسی کس مپرسی کا نہ تھا مگر آج لکھنؤ۔ اٹاوہ۔ علی گڈھ اور لاہور کے آسمان و زمین گواہ ہیں کہ مرزا صاحب ڈگمگاتے ہوئے بیڑے پر اپنے بچوں کو گلے سے لگائے باد مخالف کا مقابلہ کس حوصلہ سے کرتے رہے اور اپنی آن بان اپنی میرزایت میں فرق نہ آنے دیا۔ بھائیو کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔ ان سختیوں پر بھی مصنف کا حوصلہ مزید آزمائشوں کا تقاضا کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ ؎ کمال صبر ملا صبر آزمانہ ملا۔

مری بہار و خزاں جسکے اختیار میں تھی
مزاج اُس دلِ بے اختیار کا نہ ملا

زندگی کی ساری چہل پہل یا اوداسی محض اپنے دل کی شگفتگی یا پژمردگی پر موقوف ہے۔ مگر دل کا مزاج پالینا اور اسے اپنے قابو میں رکھنا کچھ آسان نہیں دل ہمیشہ ماحول کا تابع ہے اور ماحول آج کچھ ہے کل کچھ ماحول کو اپنی مرضی کے موافق بدل دینا انسان کے اختیار سے باہر ہے نہ دل کے مزاج پر اتنا قابو ہو سکتا ہے کہ وہ ماحول سے متاثر نہ ہو۔ شعر وہی شعر ہے جسے پڑھتے جاؤ مگر اُس کی لذت کم نہ ہو جس کا نقش مٹائے نہ مٹے۔

جواب کیا وہی آوازِ بازگشت آئی
قفس میں نالۂ جانکاہ کا مزہ نہ ملا

مثل مشہور ہے اکیلا ہنستا بھلا نہ روتا۔ عالم تنہائی و بے کسی کے مضامین

سے اساتذہ کے دواوین بھرے پڑے ہیں مگر مصنف کے اس شعر کا جواب شاید ہی مل سکے۔ اک اسیر قفس عالم تنہائی میں نالہ و فریاد کر رہا ہے نالہ بھی کیسا؟ جانکاہ۔ قفس میں یا آس پاس کوئی اُس کا ہمدرد کوئی ہم صفیر بھی نہیں جو اُس کی آواز پر آواز دیتا جس سے اُس کا کچھ غم غلط ہوتا۔ اُس کے نالۂ جانکاہ کا کوئی جواب بھی ملتا ہے تو صدائے بازگشت سے درد تنہائی کی ایسی بولتی ہوئی تصویر کیا کوئی مصور کھینچ سکتا ہے۔ شاعر نے اسیر قفس کے پردے میں اپنی بیتی کو کس درد انگیز پیرایہ میں بیان کیا ہے اور "آواز بازگشت" سے عالم تنہائی کا کتنا صحیح نقشہ دکھایا ہے اس قوت تخئیل اور اس زور بیان کی مثال جہاں تک ہمارا مطالعہ شہادت دیتا ہے اُردو کیا فارسی لٹریچر میں بھی نہیں مل سکتی۔ نفس مضمون تو مشاہدات عامہ میں سے ہے مگر شاعر کی جودت تخئیل (جواب کیا دہی آواز بازگشت آئی) اور زبان آوری نے شعر میں برقی لہر دوڑا دی ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور اُن کی نشست پر غور کرو تو تاج محل کی صنعت نگاہوں سے گر جائے۔

امیدوار رہائی قفس بدوش چلے
جہاں اشارۂ توفیقِ غائبانہ ملا

دیکھو شعر پڑھ کر دل میں کیا جوش و خروش پیدا ہوتا ہے۔ ملٹن کے نزدیک شعر کی تعریف یہ ہے کہ سادہ ہو۔ جوش سے بھرا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو۔ مولانا حالی نے ان تینوں شرائط کی تشریح بھی کر دی ہے کہ سادگی سے فقط الفاظ کی سادگی مراد نہیں ہے بلکہ خیالات بھی ایسے پیچیدہ و دقیق نہ

ہوں جو عام ذہنوں میں سما نہ سکیں۔ جوش سے فقط یہ مراد نہیں ہے کہ شاعر نے جوش کی حالت میں کہا ہو بلکہ سننے والوں کے دل میں بھی ویسا ہی جوش پیدا کرے اور اصلیت سے مراد یہ ہے کہ تخیّل کی بنا ایسی بات پر ہو جو فی الحقیقت کوئی وجود رکھتی ہو نہ یہ کہ محض وہمی و خیالی ہو۔

مرزا صاحب کے کلام کا شروع سے آخر تک مطالعہ کر جاؤ ہر جگہ یہ تینوں شرطیں بدرجۂ اتم موجود پاؤ گے۔ اسیروں کے دل میں رہائی کی امید اور امید کے ساتھ ولولہ اور ولولہ کے ساتھ توفیق غیبی کا اشارہ پاتے ہی قید کی بندشیں توڑ ڈالنا ایسی حقیقتیں ہیں جو عام مشاہدے میں آتی رہتی ہیں صفحات تاریخ جن کی گواہی دے رہے ہیں۔ ولولہ و ہمت وہ چیز ہے کہ انسان تو انسان ہے حیوان تک سے غیر متوقع امور ظہور میں آتے ہیں بشرطیکہ غیب سے توفیق عمل بھی عطا ہوئی ہو۔ ذرا انداز بیان پر غور کرو کہ اسیروں کے لئے اُمیدوار رہائی، اور امداد غیب کے لئے "توفیق غائبانہ" نے کلام میں کیا تازہ بلاغت پیدا کر دی ہے۔

انصاف تو کرو کہ گرفتاران بلا کو اس شعر میں حصول آزادی کے لئے کتنا ولولہ انگیز درس عمل دیا گیا ہے۔ اسی قسم کے اشعار ملک و ملت میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔ قوم کی ذہنیت پر ایسے نغموں کا جو خاموش اور مستقل اثر ہوتا رہتا ہے وہ بڑے بڑے لکچروں سے نہیں ہوتا۔ اگر ماحول مناسب ہو تو ایسے اشعار فوری انقلاب پیدا کر سکتے ہیں اور بعض موانع کی وجہ سے فوری انقلاب نہ ہو تو بھی قوم کے دماغ پر پوشیدہ اثر ضرور باقی رہ جاتا ہے۔

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

عمر کی تیز رفتاری کو کس خوبی سے بیان فرمایا ہے۔ اکثر مصنوعی شاعروں کی عادت ہے کہ وہ ذرا سی بات کو الجھا کر بیان کرتے اور ناواقفوں کو اپنی جدت طرازی کا فریب دیتے ہیں۔ مگر ایک حقیقی شاعر معمولی بات میں بھی اپنے زورِ بیان سے تازگی پیدا کر دیتا ہے۔ عمر کیا ہے چند سانسوں کا ہوائی کارخانہ ہے جسے شعرا کاروانِ نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ منزلِ فنا کی جانب کاروانِ نفس کی یہ گرم رفتاری دیکھ کر شاعر کی قوتِ متخیلہ کو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی قافلہ ہوا کے دوش پر اُڑتا ہوا جا رہا ہے شوقِ فنا میں زمین پر پاؤں نہیں رکھتا دیکھئے اس اندازِ بیان سے کلام میں کتنی تازگی کتنی بلاغت پیدا ہو گئی۔

ہزار ہا تھا اسی جانب ہے منزلِ مقصود
دلیلِ راہ[1] کا غم کیا ملا ملا نہ ملا

دیکھئے سالک کو اپنے دلِ آگاہ پر کتنا بھروسا ہے غیروں کی امداد سے کتنا بے نیاز و بے پروا ہے اس کا دلِ آگاہ شہادت دیتا ہے اور اشارہ کرتا ہے کہ ہزار ہا تھا (بمعنی اغلباً) منزلِ مقصود اسی طرف ہے۔ دلیلِ راہ (یعنی رہ نما) اگر کوئی نہیں تو کیا پروا قدم بڑھائے چلے چلو۔ کیا حوصلہ افزا کلام ہے۔ یہی وہ لٹریچر ہے جس کا مطالعہ قوم کی ذہنیت اور طریقِ عمل کا رخ بدل دیتا ہے۔ خود اعتمادی کا سبق دے کر زنجیرِ تقلید سے آزاد کر دیتا ہے۔

[1] دلیلِ راہ بمعنی رہ نما

بس ایک نقطہ فرضی کا نام ہے کعبہ
کسی کو مرکز تحقیق کا پتا نہ ملا

رسمیات مذاہب کی بے حقیقتی کو دل نشین کرنے کے لئے اس سے بہتر طرز استدلال شاید ہی کہیں دیکھنے میں آئے۔ غور کرو کہ وہ کعبہ مقصود وہ حقیقت مطلق جو ہر مذہب کی غایت الغایات ہے اُس کا پتہ کس نے پایا۔ کعبہ مقصود کا پتا ہی نہیں ملتا تو خود ساختہ دیر و حرم ایک نقطۂ فرضی سے زیادہ کیا وقعت رکھتے ہیں کلام کے حقایق و معارف پر اور پھر اس کے بعد شاعر کی قادر الکلامی و روشن بیانی نشست الفاظ اور ہر ہر لفظ کی نوک پلک پر غور کرو تو نظر نہیں ٹھہرتی۔ معنی کے اعتبار سے اتنا صحیح کہ کوئی منطقی زبان نہ کھول سکے۔ الفاظ کی نوک پلک ایسی کہ کوئی نکتہ چین اُنگلی نہ رکھ سکے۔

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دَیر و حرم گھر کا راستا نہ ملا

مصنف نے اس شعر میں عالم حیرت و گم گشتگی کی جو مرقع نگاری کی ہے اس کا جواب میر و غالب تو کیا صائب۔ عرفی اور نظیری کے ہاں بھی ڈھونڈھے سے نہ ملے گا۔ اوّل تو امید و بیم کی کیفیت خود ایسی بات ہے جس کی طرف ذرا سا اشارہ بھی جذبات میں تلاطم برپا کر دیتا ہے اس پر طرّہ یہ کہ شاعر کی جلالت تخیل نے دیر و حرم اور امید و بیم کو دوراہے سے استعارہ کرکے اور پھر اس کے ساتھ

"گھر کا راستہ نہ ملا" کہہ کر انتقال ذہنی و قوت اختراعی کی ایسی مثال پیش کی ہے کہ ذہن کے سامنے بجلی سی تڑپ جاتی ہے اور عالم حیرت کی وجدانی کیفیت مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ "امید و بیم نے مارا" اس لفظ "مارا" میں جو قوت ہے وہ "تباہ کر ڈالا" "برباد کر ڈالا" "کہیں کا نہ رکھا" وغیرہ سے پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ شعر و سخن کا ذوق رکھتے ہیں مگر عملی تجربہ نہیں رکھتے اور اہل زبان نہیں ہیں اس لفظ "مارا" کی قدر و قیمت کا اندازہ اُن کے امکان سے باہر ہے اس کے بعد "کہاں کے دیر و حرم" اور "گھر کا راستہ نہ ملا" پر نظر کرو تو معلوم ہو کہ ان الفاظ میں کتنی برقی قوت بھری ہے۔ انداز بیان اور معنوی حسن دونوں اعتبار سے شعر کی حدوں کو جانچو گے تو پرکار کی بنی ہوئی معلوم ہوں گی ایک ایک حرف ایک ایک نقطہ اپنی اپنی جگہ پر اس طرح رکھا گیا ہے کہ مجال نہیں کوئی قلم لگا سکے۔ مرزا صاحب کا کلام مرزا غالب کی طرح محض حسن معنوی کا مظہر نہیں ہے نہ اساتذہ لکھنؤ کی طرح محض زبان کی چاشنی رکھتا ہے بلکہ حسن معنی وصورت دونوں کا بہترین مجموعہ ہے اور اس حد کمال کی شہادت دیتا ہے۔ جس کی مثال صائب و عرفی کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی۔ سر ربندر ناتھ ٹگور کی اس وقت یورپ میں دھوم مچی ہوئی ہے اور بجا ہے مگر ٹگور کے ہاں محض شوق عبودیت کے خیالی و وہمی مضامین کے سوا اور کیا رکھا ہے۔ ٹگور کے ہاں احساسات کی لطافتیں بھی ضرور ہیں اور بعض اوقات فطرت انسانی کے متعلق پتے کی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں مگر زبان آوری کا جوہر اعلیٰ درجہ کا نہیں معلوم ہوتا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ترجمہ میں اصل زبان کا مزہ نہیں

پیدا ہو سکتا۔ مرزا یگانہ کا کلام اوّل سے آخر تک پڑھ جاؤ۔ نازک سے نازک اور پیچیدہ سے پیچیدہ احساسات کے ایسے کامل مرقعے نظر آئیں گے جو آپ اپنے منہ سے بولتے ہیں کسی مقام پر نہیں یہ نہیں محسوس ہو سکتا کہ شاعر کے احساسات لطیف اُس کی قوت بیانیہ کے دسترس سے باہر ہیں۔

خوشا نصیب جسے فیضِ عشق شور انگیز
بقدرِ ظرف ملا ظرف سے سوا نہ ملا

نعمت جبھی تک نعمت ہے کہ اندازہ ظرف سے سوا نہ ہو منصور حلاج کو عشق حقیقی کی دولت ملی تو سہی مگر کس کام کی جب اُس کا ظرف متحمل نہ ہو سکا فرقہ نصیری نے حضرت علی مرتضیٰ کے عشق و محبت میں اتنا غُلو کیا کہ حضرت کو خدا کہنے لگے مگر ایسا عشق شور انگیز جو حد سے سوا ہو کس کام کا۔ دنیا کی ہر لذت اعتدال پر موقوف ہے۔ خود زندگی اعتدال عناصر کا دوسرا نام ہے۔ اگر اعتدال قائم ہے تو زندگی کی کوئی کیفیت (شادی ہو یا غم) لذت سے خالی نہیں مگر کسی بات کا حد اعتدال سے بڑھ جانا اختلال حال کے سوا کوئی معقول نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔ اس نکتہ کو مصنف نے کتنے پر جوش کتنے مترنم الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

سمجھ میں آگیا جب عُذرِ فطرتِ مجبور
گناہگارِ ازل کو نیا بہانہ ملا

بعض قِل آعوذیوں کی طرف سے اِس شعر پر یہ اعتراض وارد کیا جاتا

ہے کہ اس قول سے مصنف کے کافرانہ عقیدے کا ثبوت ملتا ہے یعنی مصنف انسان کو مجبور جانتا ہے مختار نہیں مانتا جس سے سزا و جزا کا بطلان ہوتا ہے گویا فطرت انسانی خود ارتکاب گناہ کے لئے بہانہ پیدا کر دیتی ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ بے شک مصنف کا عقیدہ ایسا ہی کچھ ہے اور صحیح ہے۔ مصنف کے کلام سے جا بجا اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اس مسئلہ خاص میں اُس کا رجحان فرقہ جبریہ کی طرف ہے۔ ہر وہ شخص جسے تھوڑی بہت قوت فکر و اجتہاد عطا ہوئی ہے جس کا دماغ قل آعوذیوں کی طرح فرسودہ نہیں ہے، وہ اس بات پر کامل یقین رکھتا ہے کہ انسان اس محدود عقل و فہم کے ساتھ جو اُسے فطرت کی طرف سے عطا ہوئی ہے ہرگز اپنے تئیں کسی بات میں مختار نہیں سمجھ سکتا۔ مجبور ہے اور بالکل مجبور ہے۔ اس یقین کے ساتھ سزا و جزا کا مسئلہ لاینحل رہ جاتا ہے کیونکہ فطرت انسانی کا خاصہ ہے کہ وہ سزا و جزا کے وجوب سے انکار بھی نہیں کر سکتی نہ انسان کو فاعل مختار مان سکتی۔ اسی وجہ سے سزا و جزا کا معاملہ زندگی بھر کٹھائی میں پڑا رہے گا۔ یہ معمّا اس زندگی میں حل ہوا ہے نہ ہوگا۔ دنیا عالم اسباب ہے۔ انسان کا ہر فعل خواہ نیک ہو خواہ بد اسباب بہم پہنچنے پر تکمیل کو پہنچتا ہے مگر اسباب پر دسترس پانا یا اسباب پیدا کر لینا انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ جب ہمارا ہر فعل اسباب کا تابع ہے اور اسباب ہمارے دسترس سے باہر ہیں تو پھر مختار کہنا چہ معنے دارد۔ کٹھ مُلّا ایک طرف تو انسان کو مختار کہتے ہیں دوسری طرف خدا کو مسبب الاسباب بھی کہتے ہیں۔ جب مسبب الاسباب کوئی اور ہی ہستی ہے تو پھر انسان کا مختار

ہونا معلوم!

انسان کے مختار ہونے کا مُلّا دن کے پاس یہ کتنا خوب صورت ثبوت ہے کہ وہ متحرک بالارادہ ہے۔ ابھی بیٹھا ہے ابھی چاہے لیٹ جائے یا کبڈّی مارتا ہوا مکّے مدینے یا لندن پہنچ جائے مگر یہ کتنی بڑی ابلہ فریبی یا تہی مغزی کی دلیل ہے انسان کی تمام نقل وحرکت اُس کے نظام جسمانی سے وابستہ ہے۔ جبتک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں وہ اُٹھتا ہے بیٹھتا ہے چلتا ہے پھرتا ہے کھاتا ہے پیتا ہے، مگر ذرا غور تو کرو یہ سارا نظام جسمانی کیا اُسی کی مرضی یا ارادہ سے چل رہا ہے ہرگز نہیں۔ یہ نظام تو کسی بالاتر ہستی کے مقرر کردہ قانون کے تحت میں چل رہا ہے۔ جب اس نظام میں فرق آجاتا ہے تو پھر انسان کا ارادہ کوئی کام نہیں دے سکتا۔ پھر انسان ہل کے پانی نہیں پی سکتا۔ بسا اوقات وہ کسی نیک کام کا ارادہ کرتا ہے مگر نہیں کرسکتا۔ نیک کاموں کا کیا ذکر ہے بد کام کا ارادہ کرتا ہے مگر اُس کا ارادہ عمل تک نہیں پہنچتا اور اس کی وجہ یہی ہے کہ کام کو انجام تک پہنچانے کے لئے اسباب نہیں مہیا ہوتے۔ ارادہ کو قوت سے فعل تک پہنچانے کے لئے اسباب و ذرائع ناگزیر ہیں اور اسباب انسان کے دسترس سے باہر ہیں مسبب الاسباب کوئی اور ہی ہستی ہے پھر انسان کو فاعل مختار سمجھنا بوالعجبی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

فلسفہ جبر و قدر کے ان نکات کو سمجھ لینے کے بعد شاعر کی بالغ نظری و قوت فکری کی حد معلوم ہوتی ہے۔ جب انسان اپنے ہر نیک و بد میں مجبور ہے اور اس کا ہر فعل اسباب و ذرائع کا تابع ہے تو فطرت مجبور اپنی مجبوری کا عذ

پیش کر کے گناہوں کے لئے بہانہ پیدا کر لیتی ہے۔ شاعر کی اس قوت استدلال پر فلسفہ ومنطق جتنا ناز کرے بجا ہے۔ عمر خیام نے تو بس اتنا کہہ دیا کہ ؎

آنکس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو

یعنی زندہ رہ کر گناہوں سے بچنا ناممکن ہے۔ مگر عمر خیام نے ارتکاب گناہ کی مجبوری پر ایسی قوی دلیل نہیں پیش کی ہے جیسی مرزا صاحب نے "عذر فطرت مجبور" اور "گناہگار ازل کو نیا بہانہ ملا" کہہ کر پیش کی ہے۔ مذہب کے احکام اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ بھی ہوں مگر مرزا صاحب کے اس شعر نے ایک ایسی حقیقت کو جو صدیوں تک حکماء و فلاسفہ میں زیر بحث رہی ہے آئینہ کر دیا۔

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بد نصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

انسان اگر مجبور نہ ہوتا اور ہمیشہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہی ہوا کرتا تو غیر ممکن تھا کہ وہ کسی ہستی کو اپنے سے بالاتر مانتا کامیابیوں کے نشہ میں اپنی ارادہ پرستی کے سوا خدا پرستی کا اُسے دھیان بھی نہ آتا۔ دیکھو اس گہرے فلسفہ کو مصنف نے کس قوت ابداعی کس صفائی سے حوالہ قلم کیا ہے۔ دنیا کی نگاہ میں بخت کی نارسائی ایک قسم کے عذاب سے کم نہیں مگر مصنف کی رسائی فکر اور اُس کا منتہائے نظر کس قدر قابل رشک ہے کہ وہ اسی نارسائی بخت کو معرفت الٰہی کا زینہ ثابت کرتا ہے۔ مجبوری و ناکامی ہی کی وساطت سے انسان کو خدا پر یقین لانے کا موقع ملتا ہے جب مجبوری و ناکامی یا دوسرے

لفظوں میں یوں کہو کہ بخت کی نارسائی کی بدولت معرفت آلہی حاصل ہوتی ہے تو اس سے بڑھ کر خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے وائے برحال اُس کے جس نے کبھی ناکامیوں کا منہ نہ دیکھا جس کو خدا کی ہستی پر یقین لانے کا موقع نہ ملا بھلا ایسے شخص سے بڑھ کر بدنصیب اور کون ہو سکتا ہے۔ شاعر علی الاطلاق حضرت مرزا یگانہ نے اس شعر سے بدنصیبی کو عین خوش نصیبی ثابت کر کے جو کمال سخنوری دکھایا ہے اُس سے غالب تو کیا عرفی کا دیوان بھی خالی نظر آتا ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے ٹگور کی شاعری اس قسم کے حیرت انگیز کارنامے پیش کر سکے گی۔ بات ایسی تو ہو جو ذہن میں اُتر جائے عقل سلیم جسے تسلیم کر لے نہ یہ کہ محض جلوہ موہوم کی طلسم بندی ہو۔ مشرقی لٹریچر مرزا صاحب کے اس شعر پر جتنا ناز کرے بجا ہے۔ کیوں کہ اس شعر نے مغرب کے سب سے زبردست ارادہ پرست نپولین کے عقیدے (where there is a will, there is a way) کو باطل کر دیا ہے۔ نپولین کا عقیدہ تھا کہ انسان کا ارادہ خود اپنی راہ نکال لیتا ہے مگر روزمرہ کے مشاہدات اور تواریخ عالم کے صفحات نے کبھی اس قول کی تائید نہیں کی خود نپولین کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اُسکے اس بڑے بول کا سر نیچا کر دیا۔ جب نپولین کی فتوحات کا یوروپ میں ڈنکا بج رہا تھا تو انگلستان کو فتح کر لینے کا اُسے ایسا یقین تھا کہ پہلے ہی سے ایک تمغا بنوا رکھا تھا۔ جس پر یہ الفاظ کندہ تھے۔

'لندن میں بنوایا گیا'

وہ سمجھتا تھا کہ لندن کو فتح کر لینا میرے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ مگر

قدرت کا تماشا دیکھئے کہ نپولین کا یہ منصوبہ کبھی پورا نہ ہوا۔ لندن کو فتح کرنا تو کجا وہاں قدم رکھنے کا موقع بھی نہ ملا۔ وہ تمغا جو فتح لندن کی یادگار میں قبل از وقت بنوا لیا گیا تھا دھرا رہ گیا اور ساری ارادہ پرستی کی حقیقت کھل گئی۔ اولوالعزمی وخود اعتمادی انسان کی بہترین صفات میں ہیں مگر اس دھوکے میں پڑنا سخت نادانی ہے کہ انسان فاعل مختار ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ انسان بس اپنے ارادے ہی کا مالک ہے اور بس۔ مگر ارادہ سے عمل تک جو فاصلہ ہے اُسے طے کر لینا توفیق غیبی ہی پر موقوف ہے کیونکہ سررشتہ کار کسی بالاتر ہستی کے اختیار میں ہے۔

فلسفہ جبر وقدر پر مشرقی ومغربی لٹریچر میں شعرا کے سینکڑوں اشعار اور مصنفین کی تصنیفیں موجود ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ مرزا صاحب کی جلالت تخئیل وقوت استدلال نے اس شعر میں جو معجزہ دکھایا ہے اور اس کے مطالعہ سے وجود باری تعالیٰ کا جو یقین حاصل ہوتا ہے کیا غالب۔ ٹگور۔ براوننگ۔ اور شیلی کے کلام سے اس کا جواب پیش کیا جا سکتا ہے؟ اگر کوئی جواب دستیاب ہو سکے تو کسوٹی پر کس کے دیکھنا چاہئے کہ اُس میں بھی مرزا صاحب کی سی معجز نمائی کی گئی ہے یا نہیں۔

نگاہ یاس سے ثابت ہے سعی لاحاصل
خدا کا ذکر تو کیا بندۂ خدا نہ ملا

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

انسان اپنی فطرتِ مجبور پر نظر کرتا ہے تو وہ اپنے گناہوں پر پشیمان ہونے کی کوئی وجہ نہیں دیکھتا بلکہ اپنے جرم کو پرایا جرم سمجھتا ہے اس خیال سے احساس ندامت بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے۔

برا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گمراہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا

پائے سرکش کی معنوی بلاغت نے ہندوستان کے گمراہ لیڈروں کی ذہنیت کا کتنا سچا فوٹو کھینچا ہے۔ "آنا نہیں آتا" اس قافیہ کے ساتھ ردیف کا پلٹنا کس قدر مشکل تھا مگر شان استادی دیکھئے کہ لفظ "آنا" کو محاورہ (راہ پر آنا) کیساتھ لاکر ردیف کے ساتھ ایسا چسپاں کر دیا جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔ اس مقام پر بڑے بڑے لوگ ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔

ازل سے تیرا بندہ ہوں ترا ہر حکم آنکھوں پر
مگر فرمان آزادی بجا لانا نہیں آتا

ازل سے تیرا بندہ ہوں۔ تیرا حکم آنکھوں پر اور پھر ترا فرمان۔ بجالانا نہیں آتا سبحان اللہ ایک دعوے دوسرے سے کتنا متناقض ہے۔ مگر اس شوخیِ منطق

اس سحر بیانی کا کیا کہنا کہ فرمان کو لفظ آزادی کے ساتھ مشروط کر کے اجتماع نقیضین کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا۔ کہتا ہے کہ میں تیرا بندہ تو ہوں تیرے کسی حکم سے سرتابی کی مجال نہیں ہے مگر ہاں ایک فرمان آزادی بجالانا مجھ سے غیر ممکن ہے۔ بندہ تیری بندگی سے آزاد ہو جائے یہ محال ہے۔ تیرے تمام احکام پر عمل کیا جا سکتا ہے مگر تو یہ حکم دے کہ میں طوق بندگی اُتار ڈالوں تو یہ غیر ممکن العمل ہے۔ سبحان اللہ کیا شان عبودیت ہے جذبۂ عبودیت کی ایسی نادر مثالیں غالب کے ہاں تو کیا ٹگور کے ہاں بھی شاید ہی مل سکیں گی۔

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

فطرت انسانی ایک نہایت حسین۔ نہایت پاکیزہ و لطیف شے ہے۔ حیات ارضی کی عام کشاکش میں انسان کو مادی کثافتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اُس کا جوہر لطیف چھپا رہتا ہے مگر زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ وہ اپنے جوہر حقیقی کو محسوس کر کے وجد میں آجاتا ہے اور اپنی حقیقت کو پا لیتا ہے۔ وہ اس راز حقیقت سے خود تو آگاہ ہو جاتا ہے مگر دنیا کو سمجھا دینا مشکل ہے۔ اس شعر کو غور سے پڑھو تو عجیب و غریب لذت محسوس ہوگی دل ایک پر کیف روحانیت سے لبریز ہو جائے گا۔ مرزا صاحب کے انہیں اشعار نے بڑے بڑے منکروں کو سر جھکا دینے پر مجبور کر دیا ہے مگر خود غرضی و نفسانیت حسد پر آمادہ کر دیتی ہے۔ مرزا صاحب کے مخالفین کے گروہ میں دو قسم کے

لوگ ہیں ایک تو وہ جو لکھنویوں کی طرح علانیہ مخاصمانہ پروپگنڈا کرتے پھرتے ہیں اور دوسرے وہ جو مرزا صاحب کی زبردست شخصیت کے دل ہی دل میں قائل تو ضرور ہیں مگر حاسدانہ مصلحت پسندی سے خاموش رہتے ہیں زبان یا قلم کو جنبش نہیں دیتے ہاں جب کبھی موقع ملتا ہے تو مرزا صاحب کے نفس کمال سے قطع نظر کر کے اور اُن تلخ و ناگوار دمگر پر مغز تنقیدوں کا حوالہ دے کر (جو مرزا صاحب نے مرزا غالب اور دیگر شعرا کے کلام پر کی ہیں) ناواقف و خالی الذہن لوگوں کو بھڑکاتے رہتے ہیں۔ مگر کیا ان ناگوار و پر مغز تنقیدوں کی بدولت مرزا صاحب کے حقیقی جوہر مٹ جائیں گے۔ اور کیا یہ حاسدانہ پروپگنڈا ہمیشہ زندہ رہے گا لاحول ولاقوۃ۔ مرزا صاحب کی وجدانی و فلسفیانہ شاعری کی اسپرٹ تمام مخاصمانہ سازشوں پر ایک نہ ایک دن غالب آئیگی۔ یوں تو ہر انسان کی ہستی سراپا راز ہے۔ مگر مصنف کی پر اسرار شخصیت کم از کم دنیائے شعر و سخن میں جمہور اساتذہ کی سطح سے بالاتر ہے اور یہ ایک ایسا راز ہے جسے وہ خوب سمجھتا ہے مگر دنیا کو سمجھا دینا نہایت مشکل ہے یہ وہ حقیقت ہے جو تھوڑا عرصہ گزر جانے کے بعد آپ سے آپ سمجھ میں آجائے گی۔ اور دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ شاعر کتنی زبردست طاقت کا سرچشمہ ہے اُس کے ان آیات وجدانی نے ملک کی ذہینت پر کیا اثر ڈالا۔

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائیگا
مجھے سر مار کر تیشے سے مرِ جانا نہیں آتا

کلام کی مردانہ اسپرٹ اور زور بیاں ملاحظہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک

جوان مرد اتفاقات زمانہ سے مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے ناکامیوں کا ہجوم ہے
مگر وہ ہمت نہیں ہارتا اُس کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوتی۔ مایوسیوں
سے گھبراتا نہیں بلکہ اُسے یقین کامل ہے کہ دنیا کے رنج و غم چلتی پھرتی چھاؤں
ہیں۔ شدت مصائب سے گھبرا کر اپنے تئیں ہلاک کر ڈالنا نامردوں کا شیوہ ہے۔

دل بے حوصلہ ہے اک ذراسی ٹھیس کا مہمان
وہ آنسو کیا پئے گا جسکو غم کھانا نہیں آتا

مرزا صاحب کے کلام میں (Irony) طنز آمیز انداز بیان وہ
خصوصیت ہے اور اُس کی مثالیں اس کثرت سے آپ کے کلام میں پائی جاتی
ہیں جو اور اساتذہ اُردو کے ہاں بہت کم نظر آتی ہیں۔ وہ آنسو کیا پئے گا
جس کو غم کھانا نہیں آتا۔ اس طنز سے کلام میں جو زور پیدا ہو گیا ہے سادہ
انداز بیان سے ممکن ہی نہ تھا۔ دل بے حوصلہ، کو ذرا سی ٹھیس کا مہمان کہنا
فصاحت و بلاغت کی جان اور جلالت تخیل کا وہ اچھوتا نمونہ ہے جس سے
غالب کا دیوان خالی نظر آتا ہے سچ پوچھو تو یہ غالب کے بس کی بات ہی
نہیں کہ ایسی الہامی زبان میں مافی الضمیر کو واضح کر سکیں۔

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اُتر جانا نہیں آتا

دیکھئے یہاں بھی وہی (Irony) نمایاں ہے۔ ترک موالات کے ہنگامہ
میں ہندوستان کے خود غرض رہنماؤں نے ہجرت کا فتوے دے کر ہزاروں

سادہ لوح مسلمانوں کو سربصحرا ہوجانے پر آمادہ کردیا۔ آپ مزے میں رہے۔ نہ معلوم ایسے ناخدایان ملک و ملت خدا کو کیا منہ دکھائیں گے۔

اسیرو شوق آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے
مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا

آزادی و حریت کا جذبہ انسانیت کی جان ہے مگر کوئی جذبہ ہو کوئی قوت ہو اگر اعتدال و سلامت روی کے ساتھ نہیں ہے تو اس کا نتیجہ بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ترک موالات کے ہنگامہ نے ملک کو جو نقصانات پہنچائے ہزاروں ہندوستانیوں کی آیندہ زندگی کو تباہ کرڈالا اُس کا سبب کیا تھا؟ یہی چادر سے باہر پاؤں پھیلانا حد اعتدال سے تجاوز کرنا اعتدال پسند و دور اندیش محبان وطن وہ مہلک ہنگامہ دیکھتے تھے اور ہاتھ ملتے تھے۔ کچھ کہتے تھے تو بھلا اُن کی سنتا کون تھا۔ غالباً انہیں حالات سے متاثر ہوکر شاعر کے قلم سے یہ شعر نکلا ہے۔

گدگدانا اور پاؤں پھیلانا یہ دونوں محاورے ایسے ہیں کہ جاہل سے جاہل بھی سمجھتا اور بولتا ہے مگر مصنف نے انہیں الفاظ سے کلام میں وہ انقلاب انگیز قوت پیدا کردی ہے جس سے بہتر مثال ذہن میں نہیں آسکتی۔ اسی قسم کا کلام قوم کی رفتار زندگی میں اصلاح و اعتدال پیدا کردیتا ہے۔ یہ غزل مرزا صاحب نے انٹر کالج اٹاوہ کے ایک مشاعرہ میں پڑھی تھی۔ وہاں کے ایک قانون پیشہ لیڈر جو بڑے سخت تارک موالات تھے اور اپنا پیشہ چھوڑ کر

جیل خانے جانا گوارا کرلیا تھا اس مشاعرہ میں شریک تھے یہ شعر سنتے ہی سناٹے میں آ گئے اور نہایت ٹھنڈے دل سے اعتراف کرلیا کہ بیشک ترک موالات کے ہنگامے میں شریک ہو کر ہیں نے سخت غلطی کی۔ حریت وحب الوطنی کا صحیح جذبہ یہی ہے جس کی ترجمانی مرزا صاحب نے اس شعر میں کی ہے اُس دن سے اُن کا عقیدہ انتہا پسندی اعتدال پسندی سے بدل گیا۔

اگر یہ شعر آب زر سے لکھا جائے تو گویا اس کی کوئی قدر نہ ہوئی۔ ملک اور رہ نمایان ملک کو چاہیئے کہ وہ اس شعر کو اپنے لئے شمع ہدایت بنائیں ہم جا بجا مرزا صاحب کے ایسے اشعار پر توجہ دلاتے آئے ہیں جن کی نظیر غالب کے یہاں بالکل معدوم ہے اور آیندہ بھی اس حقیقت امر کی طرف اشارہ کرتے جائینگے تاکہ اہل نظر پرکھ سکیں کہ مرزا یگانہ کے ہاں مضامین عالیہ کی جو کثرت انداز بیان میں جیسی برجستگی و ندرت ہے غالب کو اُس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ غور و فکر کے ساتھ پرکھنے اور کسوٹی پر کسنے سے ثابت ہو جائے گا کہ غالب کا اُردو دیوان مرزا صاحب کے مختصر سے دیوان کے برابر تل نہیں سکتا۔ غالب کے مقابلہ میں مرزا صاحب کا اردو کلام ارتقاے کمال کے اعتبار سے منزلوں آگے بڑھ گیا ہے اور بڑھتا جاتا ہے۔ غالب کے اُردو کلام کا کچھ حصہ اُردو کے لئے تو ضرور مایہ ناز ہے مگر خود غالب کے لئے باعث فخر نہیں ہے غالب کے لئے مایۂ ناز فی الحقیقت اُن کا فارسی کلام ہے اور خود غالب کا بھی یہی دعویٰ ہے۔

بیٹھا ہوں پاؤں توڑ کے تدبیر دیکھنا
منزل قدم سے لپٹی ہے تقدیر دیکھنا

مطلع کیا مطلع الانوار ہے۔ اس عالم اسباب میں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے کوئی کام نہیں بنتا۔ مگر یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بعض خوش نصیبوں کی تدبیر معکوس بھی حسب دل خواہ نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ ایسی قسمتوں کا کیا کہنا جن کا پاؤں توڑ کر بیٹھ جانا بھی ہزاروں جد و جہد سے زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہو۔

پہنا دیا ہے طوق غلامی تو ایک دن
میری طرف بھی مالک تقدیر دیکھنا

اس شعر کی لذت اُن غریبوں سے پوچھئے جو زنجیر غلامی میں جکڑے ہوئے ہوں مگر بوئے حریت و آزادی باقی ہو۔

مجھ ناتوان کا صبر تو کیا آزماؤ گے
راس آئے تم کو جوہر شمشیر دیکھنا

معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مجبور و ناتوان کسی کے جبر و تشدد سے متاثر ہو کر 'راس آئے' کے پُر معنی فقرہ سے طنز آمیز دعا دے رہا ہے۔

آوازے مجھ پہ کستے ہیں پھر بندگان عشق
پڑ جائے پھر نہ پاؤں میں زنجیر دیکھنا
مُردوں سے شرط باندھ کے سوئی ہوئی ہے موت
ہاں دیکھنا ذرا فلک پیر دیکھنا

ہوش اُڑ نہ جائیں صنعتِ بہزاد دیکھ کر
آئینہ رکھ کے سامنے تصویر دیکھنا

صاحب طرز کی شان یہ ہے کہ کلام خود پکار اُٹھے کہ وہ کس کے قلم سے نکلا ہے۔ دیکھو اس شعر میں مصنف نے کیا سین دکھایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ایک حسین اپنی تصویر دیکھنے کے لئے بیتاب ہوتا ہے۔ اُس کا عاشق یہ بیتابی شوق دیکھ کر بول اُٹھتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مصوّر کا کمال دیکھ کر ہوش اُڑ جائیں اور تو مصوّر کے کمال پر فریفتہ ہو جائے۔ اس لئے صلاح دیتا ہے کہ تصویر دیکھنے کا شوق ہے تو اپنے سامنے آئینہ بھی رکھ لے تا کہ اصل و نقل کا فرق بھی معلوم ہو سکے۔ اس شعر کی داد غالب کے سوا کون دے سکتا۔

چونکے تو چشمِ شوق میں عالم سیاہ تھا
خوابِ نظر فریب کی تعبیر دیکھنا

آج غالب زندہ نہیں ورنہ دیکھتے کہ اردو میں حُسنِ معانی کی جو دنیا بنا کر انہوں نے پیش کی تھی اُس سے کتنی وسیع تر دنیاے معانی مرزا یگانہ نے آباد کی ہے۔ اس شعر میں دنیائے شوق و آرزو کی رنگا رنگ نظر فریبیوں کا عجیب و غریب مرقع نظر آتا ہے۔ انسان اپنے ہی شوق و آرزو کی مجسم تصویریں خواب میں دیکھتا اور رنگا رنگ خیالی منصوبے باندھا کرتا ہے مگر آنکھ کھلتے ہی سارا طلسم خیال ٹوٹ جاتا ہے آنکھیں مل مل کے دیکھتا ہے مگر اب وہ طلسم کہاں

ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ ترک موالات کے ہنگامے میں یاروں کو کیا کیا نظر فریب خواب دکھائی دے رہے تھے مگر دیکھتے ہی دیکھتے ایسی ہوا بگڑی کہ وہ سارا طلسم خواب فراموش ہو کر رہ گیا۔ سوراج تو کیا ملتا شدھی وسنگھٹن نے ہندو مسلم اتحاد کے رشتہ خام کو بھی توڑ ڈالا۔ واہ خواب نظر فریب کی کیا تعبیر ملی۔

پروانے کر چکے تھے سر انجام خود کشی
فانوس آڑے آگیا تقدیر دیکھنا

پروانوں کی خودکشی اور فانوس کا آڑے آجانا شاعر کی قوت بیانیہ کی تازہ سحر کاری ہے۔ جہاں تک ہمارا مطالعہ شہادت دیتا ہے اس مضمون کو اُردو یا فارسی کے کسی استاد نے اتنی تازگی کے ساتھ قلمبند نہیں کیا۔

شاید خدا نخواستہ آنکھیں دغا کریں
اچھا نہیں نوشتہ تقدیر دیکھنا

زندگی کا کارخانہ اُمید پر چل رہا ہے۔ اگر انسان کو حال قضا و قدر معلوم ہو جائے تو کل کا مرتا آج ہی مر جائے۔ انسان کو کچھ نہیں معلوم کہ کل اُس کے لئے کیا ہونے والا ہے۔ مگر وہ اپنی دھن میں اپنا کام کئے جاتا ہے۔ اسی بنا پر شاعر کہتا ہے کہ اپنے نوشتہ قسمت سے بے خبر ہی رہنا انسان کے حق میں بہتر ہے ورنہ نوشتہ قسمت کے مطالعہ سے خلاف امید حالات پیش نظر ہو جائیں تو جی چھوٹ جائے۔ خلاف امید امور پیش آنے کے اندیشہ کو مصنف نے آنکھوں کے دغا کرنے سے تعبیر کیا ہے جس کی بلاغت کی داد نہیں دی جا سکتی۔

اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور
بے ربطیِ نوشتۂ تقدیر دیکھنا

زندگی کے نشیب و فراز زمانے کے انقلابات جن پر انسان کا کوئی دسترس نہیں نوشتۂ تقدیر کی بے ربطی کا نتیجہ ہیں۔ ایسے لوگ شاذ و نادر ہی نظر آئیں گے جن کی زندگی ایک حال پر بسر ہو گئی ہو ورنہ ہر شخص کو نت نئے انقلابات کا سامنا رہتا ہے اور یہ سب خامہ تقدیر کی شوخیاں ہیں جن کی اصلاح کرنا البشر کی مجال نہیں۔ شاعر کی شوخی تحریر خامہ تقدیر کی ان شوخیوں کو بے ربطی سے تعبیر کرتی ہے۔ جب اِن بے ربطیوں کی اصلاح ممکن ہی نہیں تو پھر ان پر نگاہ ڈالنا ہی عبث ہے۔ سبحان اللہ کتنا تازہ اور کتنا حکیمانہ خیال ہے۔

ہر خوب و زشت آپ ہی اپنی مثال ہے
حدِ کمالِ کاتبِ تقدیر دیکھنا

ذرا ردیف کا چمکنا دیکھئے گا۔ پہلا مصرع تو عامتہ الورود ہے۔ ہر صاحب فہم اتنا سمجھتا ہے کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں بھلی یا بُری وہ سب خدا ہی کی بنائی ہوئی ہیں اور آپ اپنی مثال ہیں۔ مگر ہر خوب و زشت کو عدیم المثال پا کر کاتب تقدیر کی حد کمال کو پایہ ثبوت تک پہنچا دینا بھی ایسا کمال ہے جس نے شعر کو زمین سے آسمان تک پہنچا دیا۔

بادِ مراد چل چکی لنگر اُٹھاؤ بادباں
پھر آگے بڑھ کے خوبی تقدیر دیکھنا

• اس دور میں مرزا یگانہ کے سوا یہ خصوصیت کہیں نہ پاؤ گے کہ شعر سُن کر دل میں دریا کا سا جوش و خروش پیدا ہو جائے ہاتھوں کلیجہ بڑھ جائے کیا حوصلہ انگیز درس عمل ہے کہ جو کچھ کرنا ہے عین وقت پر کر گزرو۔ چُوک جانا تو بس قیامت ہے۔

---*---

چلے چلو جہاں لیجائے ولولہ دل کا
دلیل[1] راہ محبت ہے فیصلہ دل کا

شعر کی خوبی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ سن کر انسان جھومنے لگے۔ یہ وہ شعر ہے جسے سنتے ہی ایک نشہ سا چھا جاتا ہے اور دل پُکار اُٹھتا ہے کہ بے شک کہنے والے نے سچ کہا ہے۔ کاش اس شعر کی حقیقی لذت کوئی شخص ٹگور کو سمجھا سکتا۔

ہوائے کوچہ قاتل سے بس نہیں چلتا
کشاں کشاں لئے جاتا ہے ولولہ دل کا
گلہ کسے ہے کہ قاتل نے نیم جان چھوڑا
تڑپ تڑپ کے نکالونگا حوصلہ دل کا
خدا بچائے کہ نازک ہے انمیں ایک سے ایک
تنک مزاجون سے ٹھہرا معاملہ دل کا

[1] دلیل راہ بمعنی راہ نما۔

دکھا رہا ہے یہ دونوں جہان کی کیفیت
کرے گا ساغر جم کیا مقابلہ دل کا

کسی کے ہو رہو۔ اچھی نہیں یہ آزادی
کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

سبحان اللہ کتنا والہانہ و مستانہ رنگ تغزل ہے ایک خاص خوبی اس شعر کی یہ بھی ہے کہ تغزل کے ساتھ اخلاقی سبق کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ کسی کی زلف میں اسیر ہو جانا کسی کا ہو رہنا اُس آزادی سے کہیں بہتر ہے جو آوارگی کی مترادف ہے۔ خیال کو کچھ اور وسعت دے کر دیکھو تو یہ شعر مذہبی مطلق العنانی یعنی لامذہبیت سے بھی روکنا چاہتا ہے۔

پیالہ خالی اُٹھا کر لگا لیا منہ سے
کہ یاس کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

خدا کی پناہ فطرت انسانی کے کس حسرت آمیز پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ اس دور میں یہ شرف مرزا صاحب ہی کو ملا ہے کہ اُن کے کلام پر غور و فکر کرنے اور خصوصاً اُن کی زبان مبارک سے سن لینے کے بعد دیر تک دل قابو میں نہیں رہتا ٹگور کی شخصیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر مرزا صاحب کے کلام کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہو جائے تو معلوم ہو کہ اسی سرزمین ہند میں ایک اور شخصیت بھی موجود ہے جس نے فطرت انسانی کے نازک سے نازک نکتے کس آسانی سے حل کر

دیئے ہیں۔

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا
نگاہ شوق سے آگے تھا کاروان دل کا

بہتیرے حضرات اس دھوکے میں ہیں کہ نیچرل شاعری محض مرئیات ومظاہر قدرت تک محدود ہے حالانکہ نیچرل شاعری کا منتہائے کمال انسانکی باطنی دنیا یعنی جذبات کی ترجمانی ہے۔اس معیار سے دیکھو گے تو مرزا صاحب کے ان ابیات وجدانی سے بہتر کوئی مثال ذہن میں نہ آئے گی۔مسافر جب منزل کے قریب پہنچتا ہے تو غور کرو اس کا کیا عالم ہوتا ہے نگاہ شوق تو تھوڑی ہی دور تک کام دیتی ہے مگر تلاطم شوق واضطراب منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی گویا ہم آغوش منزل کر دیتا ہے۔نفسیات کے یہ نکتے غالب کی نگاہ سے پوشیدہ تو نہ تھے مگر اُن کا کلام شہادت دیتا ہے کہ وہ ایسی نازک کیفیتوں کو اُردوئے معلّٰی میں بیان کرنے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔

چراغ لے کے کسے ڈھونڈھتے ہیں دیوانے
نشان تو دور ہے یاں نام تک نہیں دل کا

دل جسے دل کہہ سکیں دنیا کے اس خرابہ میں اُس کا نشان تو کجا نام تک نہیں۔پھر اُسے ڈھونڈھنا اور چراغ لے کر ڈھونڈھنا دیوانہ وار شوقِ جستجو کی چلتی پھرتی تصویر ہے۔کیا اس کمال سخنوری کو دیکھتے ہوئے غالب کے کلام کو

ارتقائے شاعری سمجھنا کانشنس کے نزدیک روا ہو سکتا ہے

کبھی تو موج میں آئے گا تیرا دیوانہ
اشارہ چاہئے ہے جنبش سلاسل کا

شعر کس قدر عرفی کے مستانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ بعض لوگ خواہ مخواہ .... اساتذہ کی نقل کرنا چاہتے ہیں۔ بعض طبیعتیں قدرتاً ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ دونوں میں کچھ قدر مشترک ہوتا ہے بس وہی قدر مشترک دونوں جگہ یکساں اپنا جلوہ دکھا دیتا ہے مصنوعی تقلید سے مختلف و متبائن مزاجوں میں ہم آہنگی نہیں پیدا ہو سکتی۔ کوئی سنجیدہ آدمی ظریف یا کوئی ظریف سنجیدہ بننا چاہے تو نہیں بن سکتا۔

ازل سے اپنا سفینہ رواں ہی دھارے پر
ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا

روح کی حقیقت نامتناہی یعنی اُس کی ازلیت و ابدیت کا فلسفہ حکماء و شعرائے سلف بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ سفینۂ عمر کا دھارے پر رواں ہونا بھی قدیم تخیئل ہے مگر "ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا" اس انداز بیان نے روح بے پایاں کی مجسم تصویر بنا کر کلام میں غضب کی تازگی پیدا کر دی ہے کیا ایسے مضامین عالیہ کو اُردوے معلّٰی میں قلمبند کرنا غالب سے ممکن تھا۔ تخیئل کا زور دکھانا آسمان زمین کے قلابے ملانا کچھ مشکل نہیں ہے مگر اردوئے معلّٰی کا لباس

پہننا نا کارے دارد۔

(یاد ایام)

نہ سر میں نشہ ہے باقی نہ دل میں کیفیت
زباں پہ رہ گیا اک ذکر خیر محفل کا

(انتہائے مجبوری)

وہ دستِ شل جو دعا کیلئے بھی اُٹھ نہ سکے
ارادہ کون سے بل پر کریگا ساحل کا

(اجل پر حق و باطل کا فیصلہ)

نہ جانے جھوٹ ہی یا سچ ہے وعدۂ فردا
اجل پہ فیصلہ ٹھہرا ہے حق و باطل کا

(مرنے کے بعد کیا ہوگا؟)

پرائی موت کا احسان بھی ہے ہمیں منظور
کہیں طلسم تو ٹوٹے عدم کی منزل کا

(بے نیازی)

خود اپنی آگ میں جلتا تو کیمیا ہوتا
مزاج داں نہ تھا پروانہ شمع محفل کا

ہوا پھری افسردہ دلوں کی رت بدلی
ابل پڑا ہے پھر رنگ نقش باطل کا

ہوا پھرتے ہی افسردہ دلوں کی رُت بھی بدل گئی۔ تازہ امنگیں پیدا ہو گئیں دلی جذبات جو نقش باطل کی طرح مٹ گئے تھے ازسر نو اُبھر آئے۔ خون مُردہ پھر جوش مارنے لگا رنگ تمنا اُبل پڑا۔ سبحان اللہ کیا رنگین بیانی ہے۔

یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ فن عروض سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ اس شعر کو صحیح طور پر پڑھ نہیں سکتے۔ یہ غزل

بحر مجتث مجنوں مقصور ہے جس کا وزن (مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن) ہے مگر اس شعر کے دوسرے رکن فعلاتن پر تسکین اوسط کا زحاف واقع ہوا ہے اس وجہ سے فعلاتن، مفعولن سے بدل گیا اور اس شعر کی تقطیع مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلن، سے کی جائے گی۔ جو لوگ اس عروضی نکتے سے واقفیت اور موسیقیت سے لگاؤ نہیں رکھتے وہ اس شعر کو عجب نہیں کہ ناموزون سمجھیں۔

امید و بیم نے وہ راستا ہی چھوڑ دیا
چراغ گل ہُوا جب آستانۂ دل کا

دل کا کنول بجھا اور دنیا اندھیر ہو گئی۔ کون شخص جو دنیا میں ہمیشہ خوش رہ سکا ہوگا۔ کبھی نہ کبھی اندوہ و غم سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے۔ جو لوگ ہر وقت خوش رہنے کی مصنوعی کوششیں کرتے ہیں اُنھیں بھی یہ تلخ تجربہ ہوتا ہے۔ ایک ایسا وقت آ ہی جاتا ہے کہ دل سے دنیا کی ہوسیں فنا ہو جاتی ہیں۔ مرزا غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

اس کیفیت کو اپنی اپنی زبان میں کس نے نہیں بیان کیا۔ غالب نے بھی نہایت سادگی و بے تکلفی سے بیان کیا ہے مگر مرزا یگانہ نے کچھ اور ہی زورِ قلم دکھایا ہے۔ آستانۂ دل کا چراغ گل ہو جانا بجائے خود ایک مستقل شعر کا حکم رکھتا ہے اُس پر امید اور بیم دونوں کا کنارہ کش ہو جانا۔ جب آستانۂ دل کا

چراغ ہی گل ہو گیا تو پھر امید و بیم کا اُس راہ سے گزر ہو تو کیونکر ہو؟ وہی بات ہے جسے سادہ لفظوں میں بیان کیجئے تو معمولی بات ہے اسی کو قوت تخئیل کی رنگ آمیزی و زبان آوری چار چاند لگا دیتی ہے اور ہزار درجہ اثر بڑھ جاتا ہے شاعروں اور خطیبوں کے فرق مراتب کا راز یہی ہے۔

جوابِ حسنِ طلب بیدلوں سے بن نہ پڑا
حیا سے گڑ گئے جب نام آ گیا دل کا

دوست ہزاروں انداز حسن طلب سے دل لُبھانا چاہتا ہے۔ مگر اُس کا یہ حُسن طلب دیکھ کر بیدلوں سے کچھ بن نہیں پڑتا اپنی تہی دستی و مجبوری پر خاموش رہ جاتے ہیں بلکہ دل کا نام آتے ہی غیرت کے مارے گڑا جاتے ہیں کہ دوست کے حسن طلب کے جواب میں کیا نذر کریں۔ حوصلہ مندی اور مجبوری کی کشمکش کا کیا دردانگیز مرقع ہے۔

فلک ہے دونوں طرف کا نگاہبان جبتک
نہ اپنی آنکھ اُٹھے گی نہ پردہ محمل کا

فلک تفرقہ انداز کا قدم جب تک درمیان میں ہے اُس وقت تک نہ عشق مجازی اپنے مقصد کو پہنچ سکتا ہے نہ عشق حقیقی۔ مجاز و حقیقت کو کس حسن سے یکجا کیا ہے

جناب یاس تھے تعبیر بد سے خود آگاہ
زبانِ گنگ تک آیا نہ ماجرا دل کا

چراغ زیست بجھا دل سے اک دھواں نکلا
لگا کے آگ مرے گھر سے میہمان نکلا

معنی و بیان دونوں اعتبار سے اس شعر پر اردو ے معلیٰ جتنا ناز کرے بجا ہے۔ روح کے نکلنے کو چراغ زندگی کے بجھ جانے سے استعارہ کیا ہے۔ روح کیا ہے اک دھواں ہے جو شمع زندگی کے گل ہوتے ہی نکل جاتا ہے۔ روح چار دن تک مہمان رہ کر خانۂ دل کو آگ لگا کر یعنی تباہ و برباد کر کے رخصت ہو جاتی ہے۔

دل اپنا خاک تھا پھر خاک کو جلانا کیا
نہ کوئی شعلہ اُٹھا اور نہ کچھ دھواں نکلا

مردہ دلی کی زندہ تصویر اس سے بہتر شاید ہی کہیں نظر آئے۔

(دل مرحوم کی یاد)

سُنیں گے چھیڑ کے افسانۂ دل مرحوم
ادھر سے ملکِ عدم کا جو کاروان نکلا
تڑپ کے آبلہ پا اُٹھ کھڑے ہوئے آخر
تلاش یار میں جب کوئی کاروان نکلا

دیکھو کتنا سچا اور پُر جوش جذبہ ہے اور کلام میں کتنی برقی لہر ہے۔ غور کا مطالعہ کرنے والے داد دیں گے۔

لہو لگا کے شہیدوں میں ہو گئے داخل
ہوس تو نکلی مگر حوصلہ کہاں نکلا

ہوس اور حوصلہ کا فرق ...... کس خوبی کس آسانی سے دلنشین کر دیا ہے۔

حریم ناز میں شاید کسی کو دخل نہیں
دل عزیز بھی ناخواندہ مہمان نکلا
نہاں تھا خانۂ دل ہی میں شاہد مقصود
جو بے نشان تھا وہ دیوار درمیاں نکلا
ہے فنِ عشق کا استاد بس دل وحشی
مریضِ غم کا یہی اک مزاج دان نکلا
لگا ہے دل کو اب انجام کار کا کھٹکا
بہار گل سے بھی اک پہلوِ خزاں نکلا
زمانہ پھر گیا چلنے لگی ہوا اُلٹی
چمن کو آگ لگا کر جو باغباں نکلا
ہمارے صبر کی کھاتے ہیں اب قسم اغیار
جفاکشی کا مزہ بعد امتحان نکلا
خوشی سے ہو گئی بدخواہ میرے شادی مرگ
کفن پہن کی جو میں گھر سے ناگہاں نکلا

جذبہ حسد کی یہ تصویر اگرچہ مبالغہ سے خالی نہیں ہے لیکن بالکل بے اصل بھی نہیں ہے کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور رکھتی ہے۔ جوش حسد میں دوسرے کی تباہی و بربادی دیکھ کر ... شادی مرگ ہو جانا تو پھر بھی اک اضطراری حالت ہے جو قطعاً محال تو نہیں نادر الوقوع ضرور کہی جائے گی۔ جذبہ حسد وہ بلا ہے کہ انسان دوسروں کی بدخواہی کی دھن میں قصداً اپنے تئیں ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔

ملا حسین واعظ کاشفی نے انوار سہیلی میں ایک نقل لکھی ہے کہ بغداد میں ایک شخص رہتا تھا جو ایک ہمسایہ......... سے محض اس لئے حسد رکھتا تھا کہ شہر کے لوگ اُس کی بے حد تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ اس مرد حاسد نے اپنے ہمسایہ کو دنیا کی نگاہوں میں ذلیل کرنے کی بڑی کوششیں کیں مگر خدا جسے عزت دے اُسے کون ذلیل کر سکتا ہے۔ آخر کار فرط حسد سے تنگ آ کر اس مرد حاسد نے ایک غلام خریدا اور اُسے پرورش کرنے لگا۔ وہ برابر اپنے غلام کو یہ نصیحت کیا کرتا تھا کہ بیٹا میں تجھے اتنی شفقت سے پرورش کر رہا ہوں محض اس لئے کہ مجھے ایک دن تجھ سے ایک بڑا کام لینا ہے۔ خیر جب وہ غلام جوان ہوا تو عرض کی ارشاد ہو کون سی وہ اہم خدمت ہے۔ جو میرے لئے اُٹھا رکھی ہے۔ اس کے آقا نے اُسے دو توڑے اشرفیوں کے دیئے اور کہا کہ تو شب کے وقت میرے اس ہمسایہ کی چھت پر چل میں بھی ساتھ چلوں گا تو مجھے وہاں قتل کر کے اور اشرفیاں لیکر جہاں جی چاہے چلا جا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا ہمسایہ میرے قتل کے جرم میں گرفتار ہو کر زنجیروں میں جکڑا جائے ذلیل و رسوا ہو شہر میں لوگ اس کی بڑی عزت کرتے ہیں یہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ میں اپنی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں غلام نے کہا غریب پرور آخر یہ کون سی عقل کی بات ہے جب آپ ہی نہ رہے تو اُس کی ذلت و رسوائی کا تماشا کون دیکھے گا اس سے بہتر تو یہ ہے کہ اگر آپ حکم دیں تو میں اُسی شخص کو قتل نہ کر ڈالوں جسے دیکھ کر آپ کو اتنا رنج پہنچتا ہے۔ حاسد نے کہا نہیں اب دیر نہ کر مجھے تاب ضبط نہیں ہے اگر تو نے ایسا نہ کیا تو میرے نمک کا حق ادا نہ کیا۔ جب اُس نے اپنے حق نمک کی قسم دلوائی تو غلام

بھی مجبور رہو گیا اور شب کو ہمسایہ کی چھت پر سے جا کر اپنے آقا کو قتل کر ڈالا اور اشرفیوں کے توڑے لے کر چلتا ہوا۔

اگرچہ یہ نقل محض افسانہ ہے مگر اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ بعض اوقات انسان جوش حسد میں خود اپنی ہلاکت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مرزا صاحب کا یہ شعر اگرچہ مبالغہ پر مبنی معلوم ہوتا ہے مگر اصلیت کی جھلک ضرور دکھاتا ہے غالباً مصنف کے کلام میں مبالغہ کی یہ پہلی مثال ہے ورنہ اوّل سے آخر تک پڑھ جاؤ مرزا صاحب کے کلام میں حقیقت محض کے سوا مبالغہ کی بو تک نہ پاؤ گے۔ ایسی مثالیں آپ کے کلام میں شاذ و نادر ہی ملیں گی۔

اجل سے بڑھ کے محافظ نہیں کوئی اپنا
خدا کی شان کہ دشمن نگاہبان نکلا

"خدا کی شان" کے لفظ نے حیرت و استعجاب کے معنی پیدا کر کے کلام کو کتنا زور پہنچایا ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ کا مشہور قول ہے اَجَلُکَ حافِظُکَ سبحان اللہ موت کا کتنا سچا فلسفہ ہے۔ اس شعر میں جس کمال فصاحت و بلاغت کیساتھ ترجمہ کا حق ادا کیا گیا ہے اردو میں اس سے بہتر مثال مفقود ہے۔

دکھایا گور سکندر نے بڑھ کے آئینہ
جو سر اٹھا کے کوئی زیر آسمان نکلا

کتنا عبرت آموز سبق ہے۔ کیر کٹر کی اصلاح میں جتنا دخل اس شعر کو ہو سکتا

اتنا کتب وعظ و نصیحت سے ممکن نہیں۔ شعر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔ کہ زبان زد ہو جائے۔

لحد سے بڑھ کے نہیں کوئی گوشہ راحت
قیامت آئی جو اس گھر سے میہمان نکلا

بھلا اس "قیامت آئی" کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ یہی وہ انداز بیان ہے جس پر غالب کا کبھی دسترس نہ ہوا۔

اب اپنی روح ہے اور سیر عالم بالا
کنوئیں سے یوسف گم کردہ کاروان نکلا

روح کا عالم بالا کو پرواز کرنا، اس حقیقت کو شاعر کی قوت اختراعی نے اس بداعت اسلوب سے بیان کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ روح کا قالب خاکی سے رہا ہونا ایسا ہی ہے جیسے یوسف گم کردہ کاروان کا کنوئیں سے نکل آنا۔ انسان جب تک دنیا میں رہتا ہے اپنی حقیقت سے کس قدر بے خبر اور اپنے مرکز سے کتنا الگ رہتا ہے۔ اس قالب خاکی سے نکل کر اپنی اصل میں مل جاتا ہے۔ شعر کو بار بار پڑھو۔ وجدانی کیفیت اور بڑھتی جائے گی۔

کلام یاس سے دنیا میں پھر اک آگ لگی
یہ کون حضرت آتش کا ہمزباں نکلا
قفس کو جانتے ہیں یاس آشیاں اپنا
مکان اپنا زمین اپنی آسماں اپنا

دنیا کی وہی منتخب ہستی جسے شاعر کہتے ہیں اور ساری کائنات جس کی فکر کی جولانگاہ ہے جس کی وسعت نظر کی کوئی انتہا نہیں اُس کی مادی زندگی ایسی تیرہ و تاریک ہوتی ہے کہ قفس و آشیان اُس کے لئے یکساں ہوتے ہیں۔

(زمانہ کی نامساعدت)

ہوائے تند میں ٹھہرا نہ آشیاں اپنا
چراغ جل نہ سکا زیر آسماں اپنا

(اندیشۂ انقلاب)

سُنا ہے رنگ زمانہ کا اعتبار نہیں
بدل نہ جائے یقین سے کہیں گمان اپنا

اندیشۂ انقلاب کی مجسم تصویر ہے۔ زمانہ کے انقلاب کا ابھی تک سامنا تو نہیں ہوا ہے مگر سُن سُن کے دل کو کھٹکا لگا ہُوا ہے کہ سچ مچ کہیں دیکھتے ہی دیکھتے زمانے کا رنگ بدل نہ جائے۔ بہترین شعر وہ ہے جو زبان زد خاص و عام ہو۔

بس ایک سایہ دیوار یار کیا کم ہے
اُٹھا لے سر سے مرے سایہ آسمان اپنا

عاشق دنیا و مافیہا سے بے خبر و بے نیاز ہو کر دیار دوست کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہے۔

مرے کیساتھ ہوں اندوہ و غم تو کیا کہنا
یقین نہ ہو تو کرے کوئی امتحان اپنا

اندوہ و غم کے اقسام اور اُن کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی اپنی بداخلاقی

و بدکاری کے ہاتھوں رنج و محن میں مبتلا رہتا ہے مصیبت ور حقیقت ایسوں ہی کی مصیبت ہے جس سے روح تحلیل ہوتی رہتی ہے۔ کوئی اپنی اخلاقی قوتوں اور ادائے فرائض کی بدولت مصیبتیں اُٹھاتا ہے مگر ایسی تکلیفوں سے لذت حاصل ہوتی ہے روح بالیدہ ہوتی ہے۔ چور۔ دغاباز۔ بے ایمان بھی مصیبتوں میں گرفتار ہوتے ہیں اور محبان ملک و ملت بھی مگر ان دونوں کی نوعیتِ رنج و غم میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ اس فلسفہ غم سے شاعر کا مطمح نظر۔ اُس کا کیرکٹر اُسکا اصولِ زندگی دریافت کیا جاسکتا ہے۔

شریک حال ہوا ہے جو فقر و فاقہ میں
گڑے گا ساتھ ہی کیا اپنے میہمان اپنا

مصنف کے اس شعر پر واقعات کربلا میں سے ایک واقعہ یاد آگیا۔ کربلا میں حُر ابن ریاحی لشکر یزید کا ایک سردار اپنے امیر کا ساتھ چھوڑ کر امام حسین کی طرف آگیا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اُس کا امیر امام حسین پر ناحق ظلم و ستم کر رہا ہے۔ ادھر امام حسین کا حال یہ تھا کہ کھانا تو کجا تین دن سے دشمنوں نے پانی بھی بند کر رکھا تھا۔ ایسی مجبوری کی حالت میں حُر کا امام حسین کی مدد کو آنا اور امام حسین کا اس مہمان عزیز کی کوئی خاطر تواضع نہ کرسکنا کتنی روحانی تکلیف کا باعث ہوا ہوگا۔

حُر جب امام حسین کی طرف آیا ہے تو وہ خود بھی گذشتہ شب سے (اسی رنج میں کہ امام حسین پر یہ ظلم ہو رہا ہے) فاقہ سے تھا۔ وہ اسی فاقہ کی حالت میں امام حسین سے اجازت حاصل کرتا ہے کہ میدان میں جا کر اُن کے دشمنوں سے جنگ کرے

مختصر یہ ہے کہ وہ امام حسین کی طرف سے لڑ کر راہ حق میں شہید اور اُنہیں شہدائے کربلا کے ساتھ پیوند زمین ہوتا ہے۔ یہ سب تاریخی واقعات ہیں یہ شعر لفظ بہ لفظ حُر کے مذکورۂ بالا حالات پر صادق آتا ہے۔ بے شک حُر ایک ایسا مہمان تھا جس نے فقر و فاقہ میں اپنے غریب میزبان کا ساتھ دیا اور اُنہیں کے ساتھ پیوند زمین ہوا اور یقین ہے کہ روز قیامت کو امام حسین ہی کے ساتھ محشور بھی ہوگا۔

عجیب بھول بھلیاں ہے منزلِ ہستی
بھٹکتا پھرتا ہے گم گشتہ کاروان اپنا

وحشت آباد جہان میں روح کا بھٹکنا اپنی اصل سے جدا ہو کر مارا مارا پھرنا کس عجیب و غریب انداز سے بیان فرمایا ہے۔ منزل ہستی کو بھول بھلیاں کہنا اور روح کو ایک کاروانِ گم گشتہ سے تعبیر کرنا (اس مقام پر خصوصاً) کس قدر لطیف و پُرمعنی استعارے ہیں۔

کدھر سے آتی ہے یوسف کی بوئے مستانہ
خراب پھرتا ہے جنگل میں کاروان اپنا

انسان اپنے فہم و ادراک سے وجود باری تعالےٰ کو محسوس کرتا رہتا ہے۔ مگر اُسے پا نہیں سکتا۔ یہ نہیں معلوم وہ کہاں ہے کدھر ہے۔ اسی جستجو میں انسان کی روح حیران و سرگشتہ ہے۔ وجود حق تعالےٰ کے ادراک و احساس کو "بوئے مستانہ" کہنا لطیف و پاکیزہ استعارہ ہے۔

جرس نے مژدۂ منزل سنا کے چونکایا
نکل چلا تھا دبے پاؤں کاروان اپنا

دیکھنا یہ ہے کہ احساس بیداری کا ایسا مکمل مرقع غالب۔ ٹیگور شیلی وغیرہ کے ہاں بھی مل سکتا ہے یا نہیں۔ دنیا کے وسیع لٹریچر میں اسی مضمون کے متعدد اشعار منتخب کئے جائیں۔ اور صوری و معنوی دونوں اعتبار سے کمال صناعت کی جانچ پرتال کی جائے تو شاید ہی کوئی نمونہ مرزا صاحب کے اس شعر پر فوق لیجا سکے گا۔ خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست۔

خدا کسی کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے
قفس کے سامنے جلتا ہے آشیان اپنا

شعر وہ کہ سنتے ہی دل سے شعلے اُٹھنے لگیں۔ قفس کے سامنے آشیانے کو جلتے ہوئے دیکھ کر بھی اس بات کا یقین نہیں آتا کہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ حقیقت ہے بلکہ یہ سمجھتا ہوں کہ شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ کیا سچ مچ میرا آشیانہ جل رہا ہے نہیں ایسا غضب تو کیا ہوگا۔ اللہ اکبر کتنا دل ہلا دینے والا سین ہے۔ مرزا صاحب کے سوا اور کوئی ہوتا یا غالب بھی ہوتے تو خواب بد ہرگز نہ کہہ سکتے۔ ’روز بد‘ کہہ دیتے کیونکہ اس مقام پر یہی سامنے کا لفظ تھا یہ رسائی فکر مرزا یگانہ ہی کا حصہ ہے کہ وہ غوطہ لگا کر نہ سے اچھوتے موتی نکال لاتے ہیں۔ ’خواب بد‘ اور ’روز بد‘ کی معنوی بلاغت میں آسمان زمین کا فرق پیدا ہو گیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ

شعر ایک بار سن کر کوئی بھول جائے۔

ہمارا رنگ سخن پاس کوئی کیا جانے
سوائے آتش ہے کون ہمزبان اپنا

جو لوگ فن عروض سے بے خبر ہیں وہ بیچارے دوسرے مصرع میں لفظ آتش کو اضافت دے کر موزون کرنا چاہتے ہیں اور پھر اپنی سادہ لوحی سے اعتراض کرتے ہیں کہ واہ یہاں اضافت کے کیا معنی ہوں گے؟ بیشک یہاں اضافت کے کوئی معنی ہو ہی نہیں سکتے مگر اضافت دے کر پڑھنا خود اپنی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ بات یہ ہے کہ اس مصرع میں بھی مصنف نے ایک عروضی نکتہ رکھا ہے یعنی یہاں دوسرے رکن پر تسکین اوسط کا زحاف واقع ہوا ہے اس وجہ سے اس مصرع کی تقطیع مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن کے بدلے مفاعلن مفعولن مفاعلن فعلن پر ہوگی۔

وائے نادانی کہ داری گوش بر دیوار ما
اہل دل را روئے ما آئینہ اسرار ما

مردوں کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے۔ مردوں کی ایک شان یہ بھی ہے کہ وہ مکاروں اور منافقوں کی طرح ہر ایک کا راز ہر ایک کی کمزوریوں (weak points) کی ٹوہ میں نہیں لگے رہتے کیونکہ یہ باتیں مردانہ تہذیب کے خلاف ہیں۔ برخلاف اس کے مکاروں کا شیوہ ہے کہ وہ اپنی طرح دوسروں کو بھی مکار سمجھ کر انکی سن گن لیتے رہتے ہیں۔ مصنف کہتا ہے کہ تو میری فکر میں گوش بدیوار کیوں رہتا ہے۔

میرا ظاہر تو خود میرے باطن کا آئینہ ہے جو کچھ میرے دل میں ہے میرے چہرے سے میری بات بات سے عیاں ہے۔ دو رنگی میرا شیوہ نہیں۔

چشم پوشی شیوۂ ما حیلہ جوئی تا کجا
ایکہ باشی غائبانہ درپے آزار ما

کلام کی داد اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں کہ زبان سے نکلتے ہی دلوں میں گھر کر لے۔ خاص و عام کی زبان پر چڑھ جائے۔ موجودہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ بندگان خدا کو غائبانہ ایذائیں پہنچانا اور خود الگ تھلگ رہنا اک آرٹ اک فن بن گیا ہے۔ حیلہ جوئی کے پردے میں کمال منافقت و خباثت دکھایا جاتا ہے۔ سمجھنے والے ان ہتھکنڈوں ان گو تکوں کو خوب سمجھتے ہیں مگر اپنی عالی ظرفی سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

پیش پا افتادہ بینی صد بلند و پست را
بہرہ یابی اگر از نشۂ پندار ما

مصنف نے جا بجا اپنے جذبہ خودی و خودداری کی تصویر جس پر جوش انداز بیان کے ساتھ کھینچی ہے اُس کے سامنے دیگر معاصرین کا فلسفہ خودی محض ایک نقالی معلوم ہوتا ہے۔ مرزا صاحب کا جذبہ خودی ایک وجدانی کیفیت ہے اُنکی اصولی و عملی زندگی اس بات کی شاہد عادل ہے کہ اُن کا یہ جذبہ حقیقی ہے۔ جذبہ خودی کی ایسی روشن مثال ڈھونڈھنا چاہو تو عرفی کے سوا اور کہیں نہ ملے گی۔ یہ

وہ شعر ہے کہ اگر عرفی کے قلم سے نکلتا تو وہ بھی وجد میں آجاتا۔ یہ غزل ریاست کپور تھلہ کے ایک مشاعرہ میں جو ۲۶ جون ۱۹۲۶ء کو خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب وزیر تعلیم پنجاب کی صدارت میں ہوا تھا پڑھی گئی تھی۔ اول کے تین اشعار میں غالباً اُن مکار حاسدوں کی چشم نمائی کی گئی ہے جو یوپی سے لاہور آکر مرزا صاحب کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔

ہر سکون مضطرب آئینۂ صد انقلاب
تا سحر محو تماشا دیدۂ بیدار ما

نگاہ دور بین دیکھتی رہتی ہے کہ ہر کیفیتِ سکون اپنے اندر ایک انقلابی حرکت رکھتی ہے جو ہر وقت اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ سطحی نظر کو تہ کی خبر نہیں ہوتی مگر ایک بیدار دل آنے والے انقلابات کا قبل از وقت اندازہ کر لیتا ہے۔

کیست ازیں ہر دو کہ بکشاید درِ راز معرفت
زاہدِ شب زندہ دارے یا دلِ بیدار ما

دیکھو استفہام نے کیا مزہ دیا ہے۔ زاہد شب زندہ دار کی ظاہری آنکھیں تو کھلی ہیں مگر ہِیّا پھوٹا ہوا ہے۔ اُس کے آگے درِ معرفت کیا کھلے گا معرفتِ کامل حاصل ہوتی ہے تو دلِ آگاہ کو۔ کلام کی روانی و برجستگی کا کیا کہنا۔

تا بہ چشم ما نیرزد جز متاعِ بیخودی
رخصت اے ہوش و خرد در دکرِ دۂ بازار ما

ہوش و خرد کو رد کردۂ بازار کہنا کتنی پیاری ترکیب ہے۔ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ہوش و خرد نہیں بلکہ ایک کیفیت بیخودی ہے۔ جو انسان کو محسوسات سے بالاتر مقام پر پہنچا دیتی ہے۔

دوستانِ زندہ دل را خندہ بر لب سوختی
اے نگاہِ بے زبان اے برقِ بی زنہار ما

نگاہ اگرچہ زبان نہیں رکھتی مگر اس کی معنی خیز کیفیت ہزاروں معانی وجدانی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے میری نگاہ بے زبان تو نے برق بے پناہ کی طرح میرے زندہ دل دوستوں کو بھی افسردہ و سوختہ دل بنا دیا۔ اگرچہ بیں نے کچھ اپنا دردِ دل اُن پر ظاہر نہیں کیا مگر وہ میری نگاہوں سے میرے دل کی گہرائیوں تک پہنچ گئے اور اُن کے لبوں پر آئی ہوئی ہنسی ہوا ہو گئی۔ میرا حال زار دیکھ کر اُن کا دل بھی جلنے لگا۔ موجودہ معاصرین کی مایہ و بضاعت ان اشعار کا جواب کیا پیش کرے گی۔ البتہ غالب و عرفی وغیرہ کے ہاں ملے تو ملے۔

زخم عبرت خوردہ ایم از دست نقاش ازل
خندۂ غفلت مزن بر پیکر خونبار ما

غافلوں اور کوتاہ نظروں کو تنبیہ کرتا ہے کہ میری حالت زار میری ہیئت کذائی پر ہنستے کیا ہو۔ میں جو سراپا مجروح و دردرسیدہ نظر آتا ہوں یہ نقاش ازل کی مہربانی ہے۔ میرے پیکر خونبار پر خندہ زنی کرنا خود تمہاری غفلت و نادانی ہے میری حالت زار سے عبرت حاصل کرو۔ ایک ایک لفظ کی نوک پلک دیکھو تصویر عبرت کھینچنے میں شاعر نے کیا کمال مصوری دکھایا ہے۔ کیا کوئی مصور اس حالت کی تصویر ایسی دل آویز کھینچ سکتا ہے۔

ہر کس از بزم یگانہ دست بر دل میرود
خویش را بیگانہ سازد محرم اسرار ما

یہ تصویر بھی کتنی دردانگیز ہے۔ شاعر نے اپنی اُس حالت زار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جسے وہ بیان نہیں کرسکتا اور کچھ بیان بھی کرتا ہے تو یوں کہ اسکی قابل رحم حالت نے اُس کے رازدان پر کیا اثر ڈالا اُس کا رازدان اُس کی حالت زار کے نظارہ کی تاب نہیں لاسکتا اور دل تھام کر اُس کے پاس سے اُٹھ جاتا ہے اور اپنے تئیں بیگانہ بنالیتا ہے۔

پالا امید و بیم سے ناگاہ پڑ گیا
دل کا بنا بنایا گھروندا بگڑ گیا

"کڑی کمان کا تیر" ایسے ہی اشعار سے عبارت ہے۔ لکھنؤ میں بعض حضرات نے یہ شعر سن کر بہت زور مارا کہ اس کا جواب لکھیں۔ وہاں ایک مولوی ٹھینگا صاحب رہتے ہیں جو عرف میں موہانی کہلاتے ہیں اُنہوں نے بھی بہت زور لگایا کہ کسی طرح اس کے جواب میں اور ایک گھروندا بنائیں مگر کہنے والا کہہ گیا سو کہہ گیا "بنا بنایا گھروندا بگڑ گیا" اس کا جواب کسی سے بن نہ پڑا۔ مصرع اوّل میں مصنف نے "ناگاہ" کا وہ قیامت خیز لفظ رکھ دیا ہے کہ صورتِ حال مجسم ہو کر پیش نظر ہو جاتی ہے اُردو لٹریچر ٹھیٹھ زبان میں ایسے اعلیٰ مضامین کی بہت کم مثالیں پیش کر سکے گا۔

شربت کا گھونٹ جان کے پیتا ہوں خونِ دل
غم کھاتے کھاتے مُنہ کا مزہ تک بگڑ گیا

میاں آرزوئے لکھنوی نے بھی اس شعر پر مُنہ چڑانے کی کوشش کی اور یوں کہہ دیا کہ ؎

غم اس طرح تو کھا کہ دہن بد مزہ نہ ہو
مگر اصل اور نقل کا تفاوت کیا مٹ سکتا

اُلٹی تھی مت زمانۂ مردہ پرست کی
میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا

زمانہ ناہنجار کی اوندھی مت کا شکوہ سبھی کرتے آئے ہیں مگر مصنف نے جو چارۂ کار اختیار کیا ہے (جیتے جی مرجانا دنیا سے منہ موڑ لینا) وہ بھی ایک حکمت عملی کی دلیل ہے۔

(تسخیر نفس)

وہ مرد ہے جو زیر کرے دیو نفس کو
وہ مرد کیا جو پیر فلک سے پچھڑ گیا

کھینچی جو صدق دل سے اسیروں نے آہ سرد
پھر کیا تھا پاؤں باد خزاں کا اُکھڑ گیا

صدق دل سے آہ سرد کھینچتے ہی فصل خزاں رخصت ہو گئی دن پھر گئے۔ اس مفہوم کو "باد خزاں کے پاؤں اُکھڑ جانے" سے تعبیر کرنا کتنی تازہ عبارت ہے۔

اللہ ری کشاکش دیر و حرم کہ یاس
حیرت کے مارے بیچ دوراہے پہ گڑ گیا

✻

واں نقاب اٹھی کہ صبح حشر کا منظر کھلا
یاکسی کے حسن عالمتاب کا دفتر کھلا

آنکھ جھپکی تھی تصور بندھ چکا تھا یار کا
چونکتے ہی حسرت دیدار کا دفتر کھلا

(افشائے راز)

چپ لگی مجھکو گناہ عشق ثابت ہو گیا
رنگ چہرے کا اُڑا راز دل مضطر کھلا

(رنگ جنون)

اشک خون سے زرد چہرے پر ہوا اک طُرفہ بہار
دیکھئے رنگ جنون کیسا مرے منہ پر کھلا

رنگ بدلا پھر ہوا کا میکشوں کے دن پھرے
پھر چلی بادِ صبا پھر میکدے کا در کھلا

(تصویر تشنگی)

بند آنکھیں ہو گئیں بیتاب ہو ہو کر گرے
سامنے پیاسوں کے کس نے رکھ دیا ساغر کھلا

صحبت واعظ میں بھی انگڑائیاں آنے لگیں
راز اپنی میکشی کا کیا کہیں کیوں کر کھلا

ہاتھ اُلجھا ہے گریبان میں تو گھبراؤ نہ یاس
بیڑیاں کیونکر کٹیں زندان کا در کیونکر کھلا

قیامت ہے شب وعدہ کا اتنا مختصر ہونا
فلک کا شام سے دست و گریبانِ سحر ہونا

شبِ تاریک نے پہلو دبایا روزِ روشن کا
زہے قسمت مرے بالیں پہ تیرا جلوہ گر ہونا

حریمِ ناز میں کبتک گُھٹے کی بوئے پیراہن
ہوائے شوق میں لازم ہے اک دن منتشر ہونا

تماشائے چمن کی کیا حقیقت چشمِ عبرت میں
اثر ہونا تو لازم ہے مگر اُلٹا اثر ہونا

اسیروں کی فغاں اب اور تڑپانے لگی دل کو
قفس کی سختیوں کا چاہیئے تھا کچھ اثر ہونا

ہوائے تند سے کبتک لڑے گا شعلۂ سرکش
عبث ہے خود نمائی کی ہوس میں جلوہ گر ہونا

دلِ آگاہ نے بیکار میری راہ کھوٹی کی
بہت اچھا تھا انجامِ سفر سے بے خبر ہونا

بہار آتے ہی شادیٔ مرگ ہو جاؤں تو اچھا ہے
خزاں سے پہلے ہی بہتر ہے قصہ مختصر ہونا

دیارِ بیخودی ہے اپنے حق میں گوشۂ راحت
غنیمت ہے گھڑی بھر خوابِ غفلت میں بسر ہونا

سما سکتے نہیں الفاظ میں معنیٔ جدائی
مگر لازم ہے دل ہی دل میں پوشیدہ اثر ہونا

وہی ساقی وہی ساغر وہی شیشہ وہی بادہ
مگر لازم نہیں ہر ایک پر یکساں اثر ہونا

سُنا کرتے تھے آج آنکھوں سے تجھیں دیکھنے والے
نگاہ یاس کا سنگین دلوں پر کارگر ہونا

روشن تمام کعبہ و بتخانہ ہو گیا
گھر گھر جمال یار کا افسانہ ہو گیا
چشم ہوس ہے شیفتہ حُسنِ ظاہری
دل آشنائے معنی بیگانہ ہو گیا
صورت پرست کب ہوئے معنی سے آشنا
عالم فریب طور کا افسانہ ہو گیا

تگور کا مطمح نظر شوق لقائے محبوب ہے مگر مصنف کے نزدیک یہ محض (Ideal) ہے جو کبھی عملی صورت نہیں اختیار کر سکتا۔ حضرت موسیٰ نے جو کچھ طور پر دیکھا وہ فریب نظر کے سوا کچھ نہ تھا۔ معنی بیگانہ کے جلوے کی تاب لانا محال ہے

تکتا ہے یار ہر طرف آئینہ خانے میں
شاید کسی پر آپ بھی دیوانہ ہو گیا
کیفیت حیات تھی دم بھر کی میہمان
لبریز پیتے ہی مرا پیمانہ ہو گیا

دیر و حرم بھی ڈھہ گئے جب دل نہیں رہا
سب دیکھتے ہی دیکھتے ویرانہ ہو گیا

مرتبہ بیدلی پر پہنچکر عالمِ ہُو کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا کہاں کا دیر کہاں کا حرم۔

زنجیر پھر ہلا دی نسیم بہار نے
پھر باہر آپ سے ترا دیوانہ ہو گیا

کل کی ہے بات جوش پہ تھا عالمِ شباب
یادش بخیر آج اک افسانہ ہو گیا

کیا جانے آج خواب میں کیا دیکھا اس نے
کیوں چونکتے ہی آپ سے بیگانہ ہو گیا

فخر ہے خانۂ صیاد میں مہمان ہونا
بیگناہوں کیلئے داخلِ زندان ہونا

لبِ دریا سے غرض ہے نہ تہِ دریا سے
موج و گرداب سے ہے دست و گریبان ہونا

لذتِ درد سلامت ہے تو آسان نہیں
جان پر کھیل کے آمادۂ درمان ہونا

نفس سے صلح کا انجام یہی ہونا تھا
اپنی ہر سانس پہ رہ رہ کے پشیمان ہونا

نفس امارہ سے جس نے صلح کر لی وہ مارا پڑا۔ اس سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہنا چاہیئے۔

معنیٔ وعدۂ موہوم نے صورت پکڑی
بدگمانوں کو مبارک ہو پشیمان ہونا

مرزا صاحب کے کلام میں ([illegible]) اس غضب کی ہوتی ہے جسکا جواب نہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد' خدا کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔ عین الیقین کے مرتبہ پہنچکر دلِ آگاہ طنز آمیز پیرایہ میں شُکّکین کو اُن کی پشیمانی پر مبارک باد دیتا ہے۔

سہوِ کاتب سے ہے نام اپنا مسلماں ہیں تو
رنگ لائے گا کسی دن یہ مسلمان ہونا

قصّہ کتابِ عمر کا کیا مختصر ہوا؟
رُخ داستانِ غم کا اِدھر سے اُدھر ہوا

غالب نے تو یہیں تک کہا ہے کہ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟ یعنی مرنے کے بعد غم سے نجات ہو سکتی ہے اس سے پہلے ممکن نہیں کیوں کہ بقول غالب "قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں" مرزا صاحب نے اس شعر میں غمِ جاودانی کا فلسفہ بیان کیا ہے یعنی دنیا میں ایسی غمناک ہستیاں بھی ہیں جن کے رنج و غم بعد فنا بھی مٹنے والے نہیں فقط داستانِ غم کا رُخ یعنی نوعیتِ غم بدل جائے گی غم بجائے خود قائم رہے گا۔

ماتم سرائے دہر میں کس کس کو روئیے
اے وائے دردِ دل نہ ہوا دردِ سر ہوا؟

دُردِ دل کو دُردِ سر ثابت کر دینا کتنا مشکل تھا مگر مصنف کے زورِ قلم نے اس خوبی سے اس مشکل کو حل کیا کہ صداقت و واقعیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ یہ اندازِ بیان یہ قوتِ استدلال غالب کے ہاں خال خال ہی نظر آتی ہے۔

(رازِ خودی)

تسکینِ دل کو رازِ خودی پوچھتا ہے کیا
کہنے کو کہہ دوں اور اگر اُلٹا اثر ہوا؟
آزاد ہو سکا نہ گرفتارِ شش جہت
دل مفت بندۂ ہوسِ بال و پر ہوا

دنیا کے ساتھ دین کی بیگار الامان
انسان آدمی نہ ہُوا جانور ہُوا ؟

دیوانہ مزاج ملاؤں نے حقیقت مذہب سے بے خبر ہو کر مذہب کو اتنا مسخ کر دیا کہ تمدن کے لئے وبال جان ہو گیا۔ مذہب کی غرض و غایت تو یہ تھی کہ انسان سکون و امن کے ساتھ حیات چند روزہ کو بسر کر سکے اپنی عاقبت بھی سنوارے اور دنیا کے لئے باعث امن و امان ہو مگر افسوس ہے کہ خود غرضی و نفسانیت کے ہاتھوں شہنشاہ اکبر سا نیک نفس و صلح کل شخص بھی مذہب سے نفرت کرنے لگا۔

فردا کا دھیان باندھ کی کھتا ہی مجھ سے دل
تو میری طرح کیوں نہ وسیع النظر ہوا
فردا کو دُور ہی سے ہمارا اسلام ہے
دل اپنا شام ہی سے چراغ سحر ہوا

دل آگاہ نے جب راہ پہ لانا چاہا
عقل گمراہ نے دیوانہ بنانا چاہا
ناگہاں چرخ ستمگار نے کروٹ بدلی
بخت بیدار نے جب مجھ کو جگانا چاہا
پھر سمانے لگی دنیا کی ہوا "ٹین" کی طرح
زانوِ فکر سے جب سر کو اٹھانا چاہا

ُمیں سما جانا بمعنی غرور و نخوت پیدا ہو جانا۔ انسان جب کبھی غور کرتا ہے تو اُسے اپنی حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ کیونکر حق تعالیٰ نے ایک قطرۂ ناچیز کو یہ مرتبہ بخشا۔ مگر جہاں غور و فکر ترک کی اور دنیا کی ہوا لگی بس دماغ میں بوئے نخوت سمانے لگی۔

دل بیدار نے گھبرا کے مجھے چونکایا
نفس نے جب کسی مشکل میں پھنسانا چاہا
جذبۂ شوق نے جب عشق کی صورت پکڑی
پھر مٹائے نہ مٹا لاکھ مٹانا چاہا

جامہ زیبوں پہ کفن نے بھی دیا وہ جوبن
دوڑ کر سب نے کلیجہ سے لگانا چاہا

اس شعر میں مصنف کی رنگین بیانی قسم کھانے کے قابل ہے ایک منشی فاضل صاحب کی شامت آئے غالب کا ایک شعر مرزا صاحب کے سامنے بڑے فخریہ انداز سے پڑھ کر ندرت تخیل کی داد چاہنے لگے۔

اک خون چکان کفن میں کروروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی (غالب)

مرزا صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ جناب والا منشی فاضل کی سند حاصل کر لینا اور بات ہے اور شعر و سخن پر محاکمہ کرنا اہل الرائے کا منصب ہے۔ سنئے اور سمجھئے عرفی کے اس شعر کے مقابلہ میں غالب کے شعر کی کیا حقیقت ہے۔

حُلّہ ہا سوختہ اند اہل بہشت از غیرت

عرفی — تا شہیدان تو گلگون کفنے ساختہ اند

حق یہ ہے کہ عرفی کے اس شعر میں ایک ایک لفظ کی رنگینی پر صد بہارستان معنی صدقے ہیں۔ عُرفی کے شعر کے مقابلہ میں غالب کا شعر پانچ فی صدی نمبر پانے کا مستحق نہیں ٹھہر سکتا۔

عُرفی و غالب نے تو شہیدان عشق کے کفن کی رنگینی کا نقشہ کھینچا ہے مگر مرزا یگانہ کی جودت فکر نے مذکورۂ بالا شعر میں حسینوں کو کفن پہنا کر اُن کی جامہ زیبی کی ایسی بہار دکھائی ہے جواب تک کہیں دیکھنے میں نہ آئی۔ دیکھنے والوں پر اس جامہ زیبی کا جو اثر ہوا اُسے کس بلیسا ختگی سے دکھایا ہے دوڑ کر سب نے کلیجہ سے لگانا چاہا۔ لفظ "چاہا" کی بلاغت دیکھنے کے قابل ہے۔ یعنی حسینوں کی اس جامہ زیبی پر دل کا تقاضا تو یہ ہوا کہ کلیجے سے لگا لیجئے مگر اتنی ہمت نہیں ہوتی۔ رُعب حسن اس گستاخی کی اجازت نہیں دیتا۔

بلاغت کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ حسینوں کی جامہ زیبی مرنے کے بعد بھی طرفہ بہار دکھاتی ہے۔ ایک حسین میت کے مُنہ پر کفن بھی وہ جوبن وہ بہار دیتا ہے جس کے نظارے سے دل بے چین ہو جاتا ہے۔ بار بار یہ جی چاہتا ہے کہ دوڑ کر کلیجہ سے لگا لیجئے مگر میت کی شان میں یہ گستاخی سوءِ ادب ہے۔ سبحان اللہ کیا اعجاز بیانی ہے۔

لکھنؤ میں غزل اب یاسؔ کو پڑھنے ہی نہ دو

ذرّہ نے پہلوِ خورشید دبانا چاہا

مقطع میں لکھنویوں کے حاسدانہ پروپگنڈے کی طرف اشارہ کیاہے جنھوں نے مرزا صاحب کو بائیکاٹ کرکے یہ سمجھ لیا تھا کہ لکھنؤ میں جب پاس کو غزل پڑھنے کا موقع ہی نہ دیا جائے گا تو گویا صفحہ ہستی سے اُن کا نام ونشان ہی مٹ جائیگا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ لکھنو والوں کی حاسدانہ کوشش کچھ کارگر نہ ہوئی مرزا صاحب کا اعتبار روز بروز بڑھتا ہی گیا بقول خواجہ آتشؔ۔

اخوان کی عداوت سے ہوا شہرۂ یوسف
کچھ پیش نہیں جاتی ہے قسمت کے دھنی سے

دل کی ہوس وہی ہے مگر دل نہیں رہا
محمل نشین تو رہ گیا محمل نہیں رہا

پہنچی نہ اُڑ کے دامن عصمت پہ گرد تک
اس خاک اُڑانے کا کوئی حاصل نہیں رہا

انسان اس قالب خاکی کے ساتھ حسن حقیقی کی تلاش میں جتنی بھی خاک اُڑائے مگر رسائی محال ہے اُس کے دامن عصمت پر گرد تک نہیں پہنچ سکتی۔

رکھتے نہیں کسی سے تسلّی کی چشمداشت
دل تک اب اعتبار کے قابل نہیں رہا

آہستہ پاؤں رکھئے قیامت نہ کیجئے
اب کوئی سر اُٹھانے کے قابل نہیں

اک آخری علاج پہ ٹھہرا ہے فیصلہ
بیمار اب امتحان کے قابل نہیں رہا

پروانے اپنی آگ میں جلکر ہوئے تمام
اب کوئی بار خاطر محفل نہیں رہا

یاد آئی بوئے پیرہن یار ناصحا
اپنا دماغ اب کسی قابل نہیں رہا

تکتے ہیں یاس دور سے مُنہ آپ کا ہنوز
آنکھیں تو رہ گئیں مگر اب دل نہیں رہا

اس زمین میں غالب کی غزل بھی مشہور ہے مگر مرزا یگانہ کے ایک ایک شعر سے مقابلہ کیجئے تو فرق مراتب معلوم ہو۔

دل دُکھانے کا مزہ اے دشمن جاں دیکھنا
دل میں درد اُٹھا ہی کیونکر دیکھنا ہاں دیکھنا

آئنہ کیا دے سکے گا دادِ حُسنِ بے مثال
دیدۂ دل سے دلِ گبر و مسلمان دیکھنا

ہاں دلِ عاشق مزاج اپنی طرف بھی اک نظر
آئنہ لے کر ذرا چاکِ گریبان دیکھنا

وحشیو کیوں تنگدل ہو فصلِ گل آنے تو دو
غنچہ غنچہ میں بہارِ صد گریبان دیکھنا

پردۂ غفلت وہی ہے بس نظر کا فرق ہے
خوابِ زنگار رنگ یا خوابِ پریشان دیکھنا

یاسؔ کیا ناخواندہ مہمان تھی کہ رکھتے ہی قدم
پھٹ پڑے بام و در و دیوارِ زندان دیکھنا

خاک کا پتلا بگولا دشت کا ہو جائیگا
مٹ کے بھی اک پیکرِ نشو و نما ہو جائیگا

یہ وہ معرکہ آرا غزل ہے جو مرزا صاحب نے ۳۰۔ دسمبر ۱۹۲۲ء کو پنڈت

امرناتھ ساحر دہلوی کے مشاعرہ میں پڑھی تھی حسن معانی کا تنوع جو مرزا صاحب کا امتیاز خصوصی ہے ایک ایک شعر میں بدرجہ کمال نظر آتا ہے۔ خاک کا پتلا مٹنے کے بعد بھی بگولا بن کر بیکر نشوو نما اختیار کر لیتا ہے۔ صحرا کے بگولے کا مشاہدہ کس نے نہیں کیا مگر یہاں شاعر کی قوت متخیلہ نے اس مشاہدہ سے کتنا اچھوتا نتیجہ نکالا ہے کہ انسان مٹنے کے بعد بھی نشوو نما کی ایک انوکھی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ میر۔ سودا۔ درد۔ غالب۔ ذوق۔ مومن اور جملہ اساتذہ کے دواوین پڑھ جاؤ مگر آخر میں یہی فیصلہ کرنا پڑیگا۔ کہ اس معنی بیگانہ کی ایجاد کا سہرا میرزا یاس کے سر ہے۔

یاد رکھ اے دل کہ فطرت ہے سراپا انتقام
شعلۂ سرکش بھی پامال ہوا ہو جائے گا

فطرت کی انتقام پسندی کو مشاہدات سے ثابت کرنا کوئی دشوار بات نہیں ہے مگر اس معنوی نزاکت کے ساتھ ادا کرنا مشکل ہے۔ دوسرا کوئی ہوتا تو "شعلۂ سرکش بھی ہوا ہو جائے گا" کہہ کر سمجھ لیتا کہ شاعری کا حق ادا ہو گیا مگر مصنف کی فکر رسا نے "پامالِ ہوا" کی ترکیب سے تصویر انتقام میں کتنی رنگ آمیزی کی ہے

دردمندوں کی کہانی پر دل بے دسترس
ہاتھ ملکر فرض سے اپنے ادا ہو جائے گا

یہ دل بے مدعا بیگانۂ امید و بیم
غرق ہو کر آپ اپنا ناخدا ہو جائے گا

کیا خبر تھی دل سا شاہنشاہ آخر ایک دن
عشق کے ہاتھوں گداؤں کا گدا ہو جائے گا

بوئے یوسف خود دلیلِ منزلِ مقصود ہے
جذبِ صادق غائبانہ رہ نما ہو جائے گا

ٹیگور کے روح پرور زمزموں کا کیا کہنا مگر ذرا غور کرو یہ زمزمے بھی کسقدر روحانیت سے لبریز ہیں۔

عشق کا حُسنِ طلب اک معنیِ بے لفظ ہے
ٹکٹکی بندھ جائے گی مطلب ادا ہو جائیگا

کیا دیوان غالب سے جو بقول ایک اہل الرائے کے اسمانی صحیفہ ہے (نقل کفر کفر نباشد) ایک شعر بھی ایسا پیش کیا جا سکتا ہے جو مرزا صاحب کے اس شعر کا پاسنگ بھی ٹھہر سکے۔ جس میں عشق کے 'حسن طلب' کی ایسی بولتی ہوئی تصویر کھینچی گئی ہو۔ عشق کے حسن طلب' کو 'معنی بے لفظ' کہنا خود ایک گراں قدر ایجاد ہے۔ مگر شاعر کی قوت یہیں پر ختم نہیں وہ آگے بڑھتا ہے اور اس تصویر کو اور زیادہ اُجاگر کرتا ہے ؎

ٹکٹکی بندھ جائے گی مطلب ادا ہو جائیگا

کہکر 'معنی بے لفظ' کا ایسا کامل ثبوت دیتا ہے جو غالب کے ذہن میں ہزار برس تک نہ آسکتا غالب تو کیا اگر اساتذہ عجم میں سے کسی کے ہاں مرزا صاحب کے اس شعر سے لڑتا بھڑتا کوئی شعر نکل آئے تو بڑی بات ہے ورنہ بہ حیثیت مجموعی اس شعر کی ٹکر کا کوئی شعر بہم پہنچانا دشوار اور سخت دشوار ہے البتہ ٹیگور کا (Ideal) یعنی 'شوقِ لقا' بہت کچھ مرزا صاحب کے اس جذبہ سے ملتا جلتا

ہے دلیل بمعنی رہ نما۔

ہوا ہی مگر یہ شعر جس مرتبہ کمال پر فائز ہے اُس کی نظیر پیش کرنا آیندہ ایک صدی تک تو مشکل ہے۔

آئینہ ہے وہ زیارت گاہ جسکے سامنے
خود پرستوں کیلئے سجدہ روا ہو جائے گا

یہ شعر ہے جسے تصرفات الہامی کا نتیجہ کہیں تو کوئی مبالغہ نہیں، خود پرستوں کے لئے سجدہ کا روا ہونا، بادی النظر میں کس قدر بے ربط بات ہے مگر شاعر کی فکر فلک پیما اس انوکھے دعوے پر کیسی دلیل قاطع پیش کرتی ہے یعنی حُسن آئینے میں اپنی شان جلالی و جمالی دیکھ کر سجدہ شوق میں جھک جاتا ہے اسکی خود پرستی وخود بینی کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ آئینہ میں اپنی زیارت کرکے آپ اپنا والہ و شیدا ہو جاتا ہے۔ سبحان اللہ وصل علی کتنا الہامی تخیل ہے اور آئینہ کو زیارت گاہ سے تعبیر کرنا کیا اجتہادی تصرف ہے۔ ان اشعار کو غور سے پڑھو اور یہ پیشین گوئی یاد رکھو کہ اب دیوان غالب میزان انصاف وخرد میں کلام پاک کے برابر نہیں تل سکتا۔ اس عہد میں ان آیات وجدانی کا حقیقی قدر شناس ہو سکتا ہے تو بس ٹیگور۔

اعتبارِ وعدہ واجب بدگمانی کفر ہے
کفر سے باز آیئے وعدہ وفا ہو جائے گا

یہ وہ آسمانی نغمے ہیں کہ بڑے سے بڑا منکر سُنے تو طبیعت بحال ہو جائے۔

ہے ذراسی ٹھیس کا مہمان حبابِ جانِ بلب
اک اشارہ میں ہوا کے دم فنا ہو جائے گا

غالب کے پھندے بیت تو ہر طرف چھوٹے ہوئے ہیں۔ ان سے کوئی اتنا کہے کہ نزاکت معنوی کے ایسے حیرت انگیز نمونے اردو محلے میں کہیں نظر آئیں تو بازار مصر میں لائیں۔ کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائے۔

سانس لیتا ہوں تو آتی ہے صدائے بازگشت
کون دن ہوگا کہ اک نالہ رسا ہو جائے گا

شعر نہیں معجزہ ہے۔ ہر سانس صدائے بازگشت کی طرح پلٹ آتی ہے۔ کاش وہ دن بھی آ چکے کہ اپنا کوئی نالہ منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ مگر افسوس ہے کہ لایستاخرون ساعۃً ولا یستقدمون نے راہ روک لی ہے۔

بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دستِ ہوس
گھٹتے گھٹتے ایک دن دستِ دعا ہو جائے گا

جب تک بس چلتا ہے اس وقت تک تو ہوس کی دست درازیاں کم نہیں ہوتیں مگر آخر میں جب انسان معذور و مجبور ہوتا ہی تو وہی دستِ ہوس دستِ دعا سے بدل جاتا ہے اللہ رے انقلاب۔ غالب کا دیوان قرآن سے زیادہ حفظ کر لیا تو کیا۔ ان آیاتِ وجدانی کے دیکھنے کو ترستے ہی رہیں گے۔

چھوڑیئے دیر و حرم کو یاسؔ دلّی دور ہے
اس دورا ہے میں غضب کا سامنا ہو جائیگا

تماشا ہے مری تصویر کا بیکار ہو جانا
قلم کے زخم کھا کر پیکرِ خونبار ہو جانا

مرزا صاحب نے یہ غزل ۷۔ مارچ سنہ ۱۹۲۰ء کو کیننگ کالج لکھنؤ کے سالانہ مشاعرہ میں پڑھی تھی اور یہ آخری موقع تھا کہ مرزا صاحب لکھنؤ کے مشاعرہ میں شریک ہوئے کیونکہ شعرائے لکھنؤ نے جب آپ کا بائیکاٹ کر دیا تو آپ نے بھی عہد کر لیا کہ لکھنؤ کے کسی مشاعرہ میں نہ پڑھیں گے۔ اس کے بعد بعض لوگوں نے شیعہ کالج کے مشاعرہ میں بلایا بھی مگر تشریف نہ لے گئے۔ اس آخری غزل سرائی کا عالم محویت بھی یادگار تھا۔ "قلم کے زخم کھا کر تصویر کا پیکر خونبار ہو جانا" اس رنگینی تخیل کی مثال لکھنؤ کا سارا لٹریچر ایک طرف رکھا جائے تو بھی پیش نہیں کر سکتا۔

(جہاد نفس)
زہے مقصد جہاد نفس کو تیار ہو جانا
خوشا ہمت خود اپنے درپے آزار ہو جانا

(دوا اور دعا کا امتحان)
دوا کا اور دُعا کا امتحان منظور تھا دل کو
بھلے چنگے گوارا تھا کسے بیمار ہو جانا

(فریب ہوس)
زہے دیوانگی چشم ہوس کے پھیر میں پڑنا
ہجوم شوق میں گم گشتہ بازار ہو جانا

دنیا کی نظر فریبیوں کا کیا نقشہ کھینچا ہے۔ انسان دنیا میں پھنس کر ایسا گم ہو

جاتا ہے کہ اپنی خبر نہیں رہتی۔

قیامت تک یہ کالے کوس روشن ہو نہیں سکتے
(حقیقت مذہب)
عبث ہے ہمرکابِ کافر و دیندار ہو جانا

مذاہب مختلف نے اپنے اپنے لئے جداگانہ راہیں اختیار کر رکھی ہیں اور شوقِ منزل میں حیران و سرگشتہ ہیں تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں اور پڑے رہیں گے۔ یہ وہ کالے کوس ہیں جو قیامت تک روشن نہ ہونگے۔ خواہ کوئی کافروں کا ہمسفر ہو یا دینداروں کا منزل مقصود کی شکل قیامت سے پہلے نظر نہیں آسکتی۔

بہت میں نے ٹٹولا جادۂ شیخ و برہمن کو
کوئی آساں ہے ناہموار کا ہموار ہو جانا
(موت کا تصور)
تصور سے کبھی خوابِ اجل کے کانپ اُٹھنا
کبھی تعبیر سُن کر جان سے بیزار ہو جانا

انسان جب تک روح کی حقیقت سے واقف نہیں ہوتا اُس وقت تک موت کا تصور نہایت بھیانک معلوم ہوتا ہے اور جب یہ سمجھ میں آگیا کہ روح کو کبھی فنا نہیں اور موت ہی وصالِ محبوب کا ذریعہ ہے تو پھر یہ زندگی دوبھر ہو جاتی ہے اور اس خواب کی تعبیر کا شوق اُسے بے چین رکھتا ہے۔

عجب کیا بھول جائے طائرِ خواب آشیاں اپنا
شبِ غم دور کیا ہے راہ کا دشوار ہو جانا

قدرت نے انداز بیان کو بھی کیا اعجاز بخشا ہے۔ اگر پیش پا افتادہ باتوں

کو سیدھی سادی زبان میں کہہ دو تو معمولی بات ہے مگر ندرت بیان سے اُسی بات
میں قیامت کا اثر پیدا ہو جاتا ہے مطلب تو بس اتنا ہے کہ انسان پر جب اندوہ
و قلق کا غلبہ ہوتا ہے تو نیند اُڑ جاتی ہے مگر شاعر اسی بات کو ایک اچھوتے پیرایہ
میں بیان کرتا ہے کہ عجب نہیں شب غم کی اس ہولناک تاریکی میں طائر خواب
(یعنی نیند) اپنا آشیانہ بھی بھول جائے۔ طائر خواب کا آشیانہ کیا وہی آنکھیں
اندھیرے میں طائر خواب بھٹکتا پھرتا ہے مگر اپنے آشیانے کا پتہ نہیں پاتا۔ اس انداز
بیان کا کیا کہنا دور کیا ہے کا محاورہ اتنا برجستہ صرف ہوا ہے کہ مصنف کی قدرت
زبان کی داد نہیں دی جا سکتی۔

لہو کا گھونٹ بھی فصلِ خزاں میں مل نہیں سکتا
قیامت ہے گلوں کا ہمزبانِ خار ہو جانا

خزاں میں پانی کا قطرہ تو کیا ملے گا پھولوں کو اپنے لہو کا گھونٹ تک نصیب
نہیں ہوتا بدن میں خون کا نام نہیں رہا تو خون کا گھونٹ کیا پیتے۔ کانٹوں کی طرح
پھول بھی سوکھی ہوئی زبان بن گئے۔

کوئی طوفان آیا یا ہمارے کان بجتے ہیں
ذرا اے بندگانِ ناخدا ہشیار ہو جانا

حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ غالب ایسے استاد نے اتنی بڑی عمر پائی اور ایسے
مضامین رنگا رنگ کا انبار لگا دیا کہ نظر نہیں ٹھہرتی مگر مرزا یاس نے اس شعر میں

جس اندیشۂ ہولناک کا مرقع پیش کیا ہے یہ کس گوشہ میں چھپا ہوا تھا جس پر غالب ایسے شخص کی نظر نہ پڑی۔

عجب کیا ہی ہم ایسے گرم رفتاروں کی ٹھوکر سے
زمانے کے بلند و پست کا ہموار ہو جانا

مرزا یاس کا کیرکٹر دیکھنا ہو تو اس شعر میں دیکھو۔ زمانہ بڑے بڑوں کو اپنی رفتار پر کھینچ لاتا ہے مگر دنیا میں کبھی کبھی ایسی زبردست شخصیتیں نمودار ہوتی ہیں جو زمانے کے بلند و پست کو اپنی ٹھوکروں سے برابر کر دیتی ہیں عجب نہیں کہ ایک دن مرزا صاحب کا یہ انداز سخن سب پر غالب آ جائے۔

مبارک بوالہوس کو یاس آنکھیں مانگتے پھرنا
کسی کی دیکھا دیکھی تشنۂ دیدار ہو جانا

سلسلہ چھڑ گیا جب یاسؔ کے افسانے کا
شمع گل ہو گئی دل بجھ گیا پروانے کا

دیکھنے والوں نے دیکھا ہے اور آئندہ بھی دیکھیں گے کہ یاس نے کیسے کیسے اُستادوں کے چراغ گل کر دیئے۔ مطلع سنتے ہی محفل کی محفل کا یہ حال دیکھا گیا ہے جیسے بارود خانے میں کسی نے آگ لگا دی اور حاسدوں کے منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں دل بجھ کر رہ گئے۔ انہیں آتش بیانیوں نے لکھنؤ میں تہلکہ ڈال دیا ہے۔ شعر کے محاسن صوری و معنوی پر کچھ لکھنا فضول ہے مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید

(فیضِ عشق)

عشق سے دل کو ملا آئینہ خانے کا شرف
جگمگا اُٹھا کنول اپنے سیہ خانے کا

(اہلِ ہوس)

خلوتِ ناز کجا اور کجا اہلِ ہوس
زور کیا چل سکے فانوس سے پروانے کا

(شریفانہ رقابت)

لاش کمبخت کی کعبہ میں کوئی پھکوادے
کوچۂ یار میں کیوں ڈھیر ہو بیگانے کا

ڈھیر بمعنی مزار۔ کہتا ہے کہ رقیب (بیگانہ) کا یہ مُنہ نہیں کہ کوچہ یار میں اُس کا مزار بنایا جائے مگر جوشِ رقابت کے ساتھ شریفانہ جذبہ بھی شریک ہے جو دشمن کے ساتھ شریفانہ سلوک کی ہدایت کرتا ہے کہ رقیب کی لاش کسی ایسے ویسے مقام پر نہیں بلکہ کعبہ میں پھکوا دینی چاہیئے۔ توہین و احترام دونوں پہلوؤں کو مدِ نظر رکھ کر مصنف نے اجتماع نقیضین کو جس خوبی سے نباہا ہے وہ جودتِ فکر کا تازہ کارنامہ ہے۔

(وارفتگی)

وائے حسرت کہ تعلق نہ ہوا دل کو کہیں
نہ تو کعبہ کا ہوا میں نہ صنمخانے کا
تشنہ لب ساتھ چلے شوق میں سایہ کی طرح
رُخ کیا ابرِ بہاری نے جو میخانے کا

(شباب)

واہ کس ناز سے آتا ہے ترا دورِ شباب
جس طرح دور چلے بزم میں پیمانے کا

اہل دل مست ہوئے کھیل گئی بوئے وفا
پیرہن چاک ہوا جب ترے دیوانے کا
سرشوریدہ کجا عشق کی بیگار کجا
مگر اللہ رے دل آپ کے دیوانے کا

دیکھ کر آئینہ میں چاک گریبان کی بہار
اور بگڑا ہے مزاج آپ کے دیوانے کا

حضرت مرزا صاحب کی زبان آوری کی داد دینا تو چھوٹا منہ بڑی بات ہے یہ تو جب ممکن تھا کہ لکھنؤ و دہلی کے اگلے اساتذہ پھر سے زندہ ہو جاتے آئینہ میں چاک گریبان کی بہار دیکھ کر ایک دیوانہ عاشق مزاج کی کیفیت نفسی کا جو مرقع اس شعر میں دکھایا گیا ہے وہ محاکات کا ایسا کامل نمونہ ہے جو شاید ہی کہیں نظر آئے۔

کیا عجب ہے جو حسینوں کی نظر لگ جائے
خون ہلکا ہے بہت آپ کے دیوانے کا

"خون ہلکا ہے" جس مقام پر کہا ہے اس کی لذت اس کی معنوی خوبیاں کچھ اہل زبان ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ عموماً حسینوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ فلاں کا خون بہت ہلکا ہے یعنی اُسے بہت جلد نظر لگ جاتی ہے۔ یہاں مصنف نے ایک دیوانۂ عاشق مزاج کے خون کو ہلکا کہہ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فقط حسینوں

ہی کو عاشقوں کی نظر نہیں لگتی بلکہ عشاق بھی اپنی ذات میں جوہر حُسن رکھتے ہیں اُنہیں بھی کبھی کبھی حسینوں کی نظر لگ جاتی ہے۔ اس سے مصنف کے ذوق نظر اور تعلق حُسن و عشق کے صحیح مطالعہ کا پتا چلتا ہے۔ ایسی نازک حقیقتوں کو اس قادر الکلامی سے اُردوئے معلیٰ میں ادا کرنا نہایت دشوار ہے۔

آپ اب شمع سحر بڑھ کے گلے ملتی ہے
بخت جاگا ہے بڑی دیر میں پروانے کا

صبح کی اُٹھتی ہوئی محفل کا سماں کتنے پُرجوش الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ 'بڑھ کے گلے ملنے' سے ایہام نے عجب حسن پیدا کر دیا ہے ایک معنی تو یہ ہوئے کہ شمع کا شعلہ خود آگے بڑھ کر پروانوں سے گلے ملتا ہے۔ دوسرے معنی یہ پیدا ہوئے کہ صبح کو شمع جب بڑھنے کو ہوتی ہے (یعنی بجھنے لگتی ہے) تو شعلہ خود بڑھ کر پروانوں سے گلے ملتا ہے گویا شمع چلتے چلتے گلے مل کر رخصت ہوتی ہے شمع کا خود بڑھ کر گلے ملنا پروانوں کی بیداری بخت کی دلیل ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ پروانوں کے نصیب جاگے بھی تو کب ؟ جب چل چلاؤ کا وقت تھا۔

بزم میں صبح ہوئی چھا گیا اک سناٹا
سلسلہ چھڑ گیا جب یاس کے افسانے کا

جن آنکھوں نے مرزا صاحب کو ہندوستان کی بڑی سے بڑی ادبی محفلوں میں پڑھتے ہوئے دیکھا ہے وہ شہادت دے سکتی ہیں کہ محفل کی محفل پر وجد کا عالم طاری ہو گیا ہے سناٹا چھا گیا ہے۔

کعبۂ مقصود خلوتخانۂ دل ہو گیا
جلوۂ موہوم آخر خضر منزل ہو گیا

انسان جب کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر کسی کا دھیان باندھتا ہے تو پہلے ایک دھندلی سی جھلک دکھائی دیتی ہے پھر رفتہ رفتہ وہی تصور صادق مشاہدہ کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وہی جلوۂ موہوم بڑھتے بڑھتے مشق تصور کے لئے خضر منزل ہو گیا آخر کار جمال یار سے آنکھیں روشن ہو گئیں گویا خلوتخانۂ دل کعبۂ مقصود بن گیا۔

عشق سے آئینۂ ادراک کے جوہر کھلے
خانۂ دل شاہد معنی کی منزل ہو گیا

شعر کو غور سے پڑھو اور ایشیائی شاعری کی عظمت وشان کا اندازہ کرو۔
ٹیگور کی شاعری کا خلاصہ جو کچھ ہے یہی ہے۔

وحشت آباد جہان کی دلفریبی دیکھئے
سینکڑوں آزاد پابند سلاسل ہو گیا

"سینکڑوں آزاد پابند ہو گیا" یہاں یہ دھوکا نہ کھانا چاہیئے کہ شاعر نے جمع کے ساتھ فعل واحد لاکر دھوکا کھایا ہے۔ بس اتنا سمجھ لو کہ یہ مرزا یاس کا کلام ہے اہل زبان سے شاذ و نادر ہی سہو ہوتا ہے مگر اسے سہو نہ سمجھنا یہ عین روزمرہ ہے۔

خامۂ قدرت کی ہر صنعت ہے آپ اپنی مثال
امتیازِ خوب و زشت آنکھوں کو مشکل ہو گیا

غش ہیں سب اہلِ نظر اس بولتی تصویر پر
خاک تجھے پتلے کو کیا اعجاز حاصل ہو گیا؟
جذبۂ صادق نے کھینچی خوب تصویرِ وطن
صحنِ دل گلدستۂ یارانِ یکدل ہو گیا

ناتوانی کا بُرا ہو غش پہ غش آنے لگے
دو گھڑی دل کھول کر رونا بھی مشکل ہو گیا
تم سراسر رنج دینے پر جب آمادہ ہوئے
میں سراپا درد سہنے کے لئے دل ہو گیا

اس طلسمات عناصر کی حقیقت کھل گئی
جب گڑھے میں گور کے انسان داخل ہو گیا

دورِ آخر میں نہیں کوئی کسی کا آشنا
دیکھتے ہی دیکھتے کیا رنگ محفل ہو گیا
یاس اب تنگ آ گئے اس ململِ تن پوشاک سے
جامۂ تن دھجیاں لینے کے قابل ہو گیا

✻

اب چین گنہگاروں کو دم بھر نہیں ملتا
پیلے سے ہیں اور آب دمِ خنجر نہیں ملتا
خنجر انہیں ملتا ہے تو ہم کو نہیں پاتے
جب ہمکو وہ پاتے ہیں تو خنجر نہیں ملتا
آرام سے سونے کی جگہ ہے تو لحد ہے
دنیا میں تو راحت کا کوئی گھر نہیں ملتا
کسریٰ کا محل بھی ہے ہمیں قبر سے بدتر
آرام کہیں گھر کے برابر نہیں ملتا
کیوں نقش قدم دیکھ کے کھاتے ہو پچھاڑیں
کیا قافلہ سے کوئی بچھڑ کر نہیں ملتا

یاران رفتہ سے جو بچھڑ کر رہ گئے ہیں وہ اُن کے نقش قدم دیکھ دیکھ کر دردِ جدائی سے تڑپ رہے ہیں خاک پر پچھاڑیں کھا رہے ہیں اُن کا یہ اضطراب دیکھ کر کوئی ہمدرد اس طرح تسکین دیتا ہے کہ یاران رفتہ کی یاد میں اتنے بیتاب کیوں ہو ایک دن وہ آئے گا کہ تم بھی اپنے قافلہ سے جا ملوگے۔ کیا درد انگیز نظارہ ہے۔

کچھ دل کی لگی اور بھڑک جاتی ہے ساقی
ملتا بھی ہے اک جام تو بھر کر نہیں ملتا
کیوں پاس یوں ہی دور سے مُنہ تکتے رہوگے
لے مانگے تو اس بزم میں ساغر نہیں ملتا

دنیا کا چلن ترک کیا بھی نہیں جاتا
اس جادۂ باطل سے پھرا بھی نہیں جاتا
زندانِ مصیبت سے کوئی نکلے تو کیونکر
رُسوا سرِ بازار ہوا بھی نہیں جاتا
دل بعد فنا بھی ہے گرانبارِ امانت
دنیا سے سبکدوش اُٹھا بھی نہیں جاتا
کیوں آنے لگے شاہد عصمت سرِ بازار
کیا خاک کے پردے میں چھپا بھی نہیں جاتا

اک معنیِ بے لفظ ہے اندیشہ فردا
جیسے خطِ قسمت کہ پڑھا بھی نہیں جاتا

بیش خیمہ موت کا خواب گراں ہو جائیگا
سیکڑوں فرسنگ آگے کارواں ہو جائیگا
قالبِ خاکی کہانتک ساتھ دے گا روح کا؟
وقت آجانے دو اک دن امتحان ہو جائیگا
شب کی شب مہمان ہے یہ ہنگامۂ عبرت سرا
صبح تک سب نقش پائے کاروان ہو جائیگا
چشم نامحرم کجا اور جلوۂ محشر کجا
پردۂ عصمت وہاں بھی درمیان ہو جائیگا

اشک ٹپکے یا نہ ٹپکے دل بھر آئے گا ضرور
آہ کرنے دیجئے آپ امتحان ہو جائے گا

چپکے چپکے ناصحا پچھلے پہر رو لینے دے
کچھ تو ظالم چارۂ دردِ نہاں ہو جائیگا

سایہ دیوار سے لپٹے پڑے ہو خاک پر
اُٹھ چلو ورنہ وہ کافر بدگمان ہو جائے گا

پاس اس چرخ زمانہ ساز کا کیا اعتبار
مہربان ہے آج۔ کل نا مہربان ہو جائیگا

(حسرت رہائی)
پر تولنے لگے پھر اسیرانِ بد نصیب
شاید قریب آ گیا موسم بہار کا

(رنج خمار)
انگڑائیوں کے ساتھ کہیں دم نکل نہ جائے
آسان نہیں ہے رنج اُٹھانا خمار کا

(وحشیوں کی جامہ زیبی)
دیکھو تو اپنے وحشیوں کی جامہ زیبیاں
اللہ رے حسن پیرہن تار تار کا

(تصویر نزع)
تصویر نزع دیکھنا چاہو تو دیکھ لو
رہ رہ کے جھلملانا چراغ مزار کا

دل ناکام کو کب وصل کا یارا ہوتا　　شادیِ دولت دیدار نے مارا ہوتا

دور اتنی نہ کبھی پہنچتی عدم کی منزل کاش کچھ نقش قدم ہی کا سہارا ہوتا
دیکھتے رہ گئے یاس آپ نے اچھا نہ کیا
ڈوبتے وقت کسی کو تو پکارا ہوتا

امید و بیم میں کٹے تو کیا مزہ شباب کا ہوائے دہر دیتی ہے پیام انقلاب کا
الٹ نہ جائے ناگہاں ورق مری کتاب کا

کسی کی کیا مجال ہے جو چرخِ پیر سے لڑے اُمنڈ رہا ہے ابر غم نہ جانے کب برس پڑے
رندھا ہوا ہے چار سمت بادل انقلاب کا

ہوائے تند دل جلوں کے دل کو روندتی ہی گیا قفس پہ میرے بیدھڑک یہ برق کوندتی ہی گیا
چلے گا بیدلوں سے کچھ نہ زور اضطراب کا

نہ مبتدا کی کچھ خبر نہ کچھ خبر کی مبتدا دل شکستہ گم ہوا تو پھر کہاں کا سلسلہ
یہی ورق نکل گیا تو مول کیا کتاب کا

نگاہ تشنہ کام میں حرام بھی حلال ہے نہ کوئی امر ممتنع نہ کوئی شی محال ہے
فریب تجھ سے پوچھئے کرشمہ سراب کا

پکارنے سے کام ہے پکارتا ہوں بار بار دیار حسن میں ہو یاس کیوں کوئی امیدوار
جواب باصواب یا جواب بے صواب کا

نقش باطل ہو چلا خواب پریشان بہار
دیدۂ حیران میں کھچ کر آ گئی جان بہار

مرزا صاحب کا یہ ماسٹر پیس اردو لٹریچر کا وہ کارنامہ جس سے تمام اساتذہ سابق کے کلیات خالی نظر آتے ہیں۔ ایک ایک شعر میں بہار کا وہ عبرت انگیز پہلو دکھایا ہے کہ اہل دل نظارہ کی تاب نہیں لا سکتے۔ دیدۂ حیران میں کھچ کر آ گئی جان بہار، بہار کی مٹتی ہوئی تصویر کتنے دردناک الفاظ میں کھینچی ہے۔

ہوشیار اے چشم نرگس اے نگہبان بہار
ہے زوال رنگ و بو دست و گریبان بہار

فدائیان غالب آنکھوں پر ٹھیکری رکھ کر جو چاہیں کہیں مگر چشم نرگس کو نگہبان بہار کہہ کر مصنف نے جو داد رنگین بیانی دی ہے اُس کی مثال غالب کا دیوان نہیں پیش کر سکتا۔ شاعر کا زور قلم فقط اسی تازہ کاری پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ آنے والے انقلاب سے متنبہ کرتا ہے کہ زوال رنگ و بو بھی اس بہار چند روزہ سے دست و گریبان ہے۔ یہ طلسم رنگ و بو دیکھتے ہی دیکھتے ٹوٹ جائے گا۔ شعر پر غور کرو تو دل ہل جائے۔

آگ برسائے فلک یا آب حیوان بہار
زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے پشیمان بہار

پشیمان بہار کی تازہ ترکیب اور اس کی معنوی کیفیت پر غور کرو۔ خیالات میں کتنا تموج پیدا ہو جاتا ہے۔ پشیمان بہار اس فریب رنگ و بو سے ایسے بیزار ہوئے کہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے اب فلکِ شعبدہ باز آبِ حیوان برسائے یا آگ برسائے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ یہ وہ جذبات و کیفیات ہیں جو زندگی کے نشیب و فراز زمانے کے سرد و گرم دیکھنے کے بعد انسان کو دنیا کے طلسم فریب سے آزاد کر دیتے ہیں۔

چشمِ پُرخون نے مجسم کر دیا موہوم کو
ورنہ بے تعبیر تھا خوابِ پریشان بہار

شاعر کی رسائی فکر ملاحظہ ہو چشم پرخون کی گلکاریوں سے بہار کے خواب پریشان کی کیا تعبیر نکلی ہے چشم خونبار نے بہار کی مجسم تصویر دکھا کر خواب پریشان کو اصل کر دکھایا۔ یہ اشعار اردو شاعری کے ایسے ارتقائی نمونے ہیں جن کے سامنے اگلے اساتذہ کا کلام روز بروز مدھم پڑتا جائے گا۔

چاندنی کی سیر کرتے ہم سے آنکھیں مانگ کر
ہیں کدھر پروانہ شمعِ شبستانِ بہار

کہتا ہے کہ نہ معلوم پروانوں کا دھیان کدھر ہے نہ جانے کیوں شمع کے حُسن پر مٹے جاتے ہیں۔ کاش ہم سے آنکھیں مانگ کر بصیرت پیدا کرتے اور چاندنی کی سیر کرتے۔ موسم بہار میں چاندنی سے آنکھوں کو جو نور و سرور حاصل ہوتا

ہے وہ شمع کی روشنی سے ممکن ہی نہیں۔ سبحان اللہ کتنے گہرے حقائق ہیں۔

اپنا ہاتھ اپنا گریبان اپنا سودا اپنا سر
استخارہ کر چکے پابندِ فرمان بہار

استخارہ کر چکے یعنی وہ لوگ جو فرمان بہار کے پابند ہیں استخارہ کیوں کرنے لگے۔ استخارے کے پابند کیوں ہوں اُن کے لئے فرمان بہار کافی ہے۔ بہار آتے ہی اپنا گریبان ہے اور اپنا ہاتھ۔ کسی استخارہ یا استشارہ کی ضرورت نہیں۔ واہ کیا مستانہ انداز تغزل ہے اور کیا معنوی لطافتیں ہیں۔

پیرہن کیا گھر بھی خوش وقتی کے مارے تنگ ہے
آشیان ہے اپنے حق میں طُرفہ زندان بہار

کیا فرط مسرت کی ایسی نادر تصویر غالب کے کلام سے پیش کی جاسکتی ہے اس ردیف کے ساتھ "زندان" کا قافیہ کس قدر مشکل تھا۔ اس قافیہ کے ساتھ ایسی وجدانی کیفیت کو حوالۂ قلم کرنا مرزا صاحب ہی کی رسائیٔ فکر سے ممکن تھا جوش مسرت میں پیراہن کا تنگ ہوجانا تو معمولی بات ہے مگر شاعر کہتا ہے کہ پیراہن تو پیراہن ہے خوش وقتی کے مارے آشیان بھی تنگ نظر آنے لگا ہے بھلا اس زور قلم کا کیا ٹھکانا ہے یہی وہ باتیں جو فلسفی کے دسترس سے باہر ہیں۔ ایسے نتیجے نکالنا فلسفی کے تخیل سے ممکن نہیں۔ کثرت رنج والم سے انسان کو اپنا گھر بھی قید خانہ معلوم ہوتا ہے مگر وفور مسرت میں آشیانے کا تنگ ہوجانا ایسی حقیقت ہے جس کی زندہ

تصویر کھینچنا نہ کسی فلاسفر سے ممکن ہے نہ کسی مصور سے۔ اگر یہ شعر غالب کے قلم سے نکلتا۔ تو لوگ نہ معلوم کتنا ناز کرتے۔ مرزا صاحب کا کلام اوّل سے آخر تک پڑھ جاؤ مبالغہ کا نام تک نہ ہوگا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تخیل مگر کوئی بات بوئے صداقت وحقیقت سے خالی نہ ہوگی۔ کلام کی واقعیت اور اس کے ساتھ یہ زور بیان پُر اثر کا کیا پوچھنا۔

حاشئے کیا کیا چڑھاتے ہیں قفس میں زندہ دل
مردہ دل کہتے ہیں بے معنی ہے فرمان بہار

قفس میں زندہ دل بھی ہیں اور مردہ دل بھی۔ زندہ دلان قفس فرمان بہار پر ہزاروں امید افزا حاشئے چڑھاتے ہیں۔ شوق رہائی اور سیر چمن کے تصوّر میں کیا کیا خیال آرائیاں کرتے ہیں مگر مردہ دلوں کی نظر میں سارا فرمان بہار ایک نامۂ بے معنی معلوم ہوتا ہے۔

کیوں قفس بر دوش پھرتے ہیں اسیران ہوس
ننگِ یاران چمن ناخواندہ مہمان بہار

اسیران بدنصیب آزادی کی ہوس میں قفس بر دوش پھڑپھڑاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یاران چمن کے غول میں شامل ہو کر خود بھی آزادی کے مزے اٹھائیں مگر آزادوں اور اسیروں کی برابری کیا۔ کوئی مجبور و محکوم قوم آزاد قوموں کے برابر کیونکر آسکتی ہے۔ اگر آزادوں کی قطار میں گھس بیٹھ کر شامل بھی ہو جائے

تو بار خاطر ہو کر نکال دی جائے گی۔ خدا کسی کو مجبور و بیدست و پا نہ کرے۔

اے خزاں پروردہ دل فکر چمن سے باز آ
اپنے اوپر رحم کر اے دشمن جان بہار

خزاں پروردہ دل کو دشمنِ جانِ بہار کہنا فن بلاغت کا معجزہ ہے جس کی نشو و نما گہوارۂ زوال میں ہوئی ہو اُس کی ذہینیت منازل عروج و اقبال کا صحیح اندازہ کیونکر کرسکتی ہے اُسے جو سُوجھے گی اُلٹی سُوجھے گی۔ ایسی ذہینیت کے لئے اس سے بہتر نصیحت اور کیا ہوگی کہ تو اپنے سودائے خام سے باز آ، اپنی حالت پر رحم کر۔ تیری فکر نارسا تیرے ارادۂ ناقص کی بدولت تیری رہی سہی بات بھی بگڑ جائے گی۔

قافلے کا قافلہ مارا ہوائے دہر نے
رہ گئے سوتے کے سوتے سب حسینان بہار

شعر پڑھتے ہی اک سناٹا سا دوڑ جاتا ہے۔ ہوائے دہر کے ایک ہی جھونکے نے سارے حسینان بہار کو موت کی نیند سلا دیا۔ انقلاب دہر کیا دردناک سین دکھایا ہے یہاں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ "قافلہ کا قافلہ مارا" میں لفظ "مارا" مرزا یاس ہی کے قلم سے نکل سکتا تھا دوسرا کوئی ہوتا تو "مارا" کی جگہ "لوٹا" کہدیتا۔ فدائیان غالب اگر غیرت رکھتے ہیں تو ان اشعار کا جواب دیوان غالب سے پیش کریں۔

خار و گل دونوں کو اپنے بانکپن پر ناز ہے
دیکھئے رہتا ہے کس کے ہاتھ میدان بہار۔

مصنف کا ذوق نظر اور رسائی فکر ملاحظہ ہو۔ مشاہدات فطرت کو انسانی زندگی کے حالات سے مطابق کر کے کیا نتیجہ نکالتا ہے۔ دنیا میں عزیز سے عزیز اور ذلیل سے ذلیل ہستیاں موجود ہیں مگر فطرت نے سب میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ودیعت کی ہیں جن پر جتنا بھی ناز کیا جائے بجا ہے۔ عزیز و ذلیل تو محض اعتباری الفاظ ہیں۔ شاعر نیچر کا مطالعہ زیادہ گہری نظر سے کرتا ہے اور اُس میں سے مخفی باتیں نکال کر اپنے پیرایہ اور اپنے رنگ میں اُن کی تبلیغ کرتا ہے۔ اپنی رسائی فکر اپنے نقطہ نظر سے مناظر قدرت کی تفسیر کرتا ہے اسی وجہ سے شاعر سب سے بڑا فلاسفر اور اُستاد مانا گیا ہے۔ شاعر کی اس بیش بہا خدمت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ انسان اور انسانی فطرت کا قدرت سے مقابلہ کر کے دکھاتا ہے اور ان دونوں میں جو نسبتیں ہیں اُنہیں اپنی رنگین بیانی سے واضح کر کے حیرت انگیز نتیجے نکالتا ہے۔ شاعر انسان کی فطرت میں خار و گل کی سی نسبت کا مشاہدہ کرتا ہے دور کیوں جلیئے طبقہ شعرا پر غور کیجئے تو معلوم ہو کہ ادنیٰ و اعلیٰ دونوں اپنے نشہ سخنوری میں مست ہیں مگر آخر میں حسن قبول اور حیات جاودانی کس کو ملے گی اس کا فیصلہ زمانہ کے ہاتھ ہے۔ انشاء اللہ ایک نہ ایک دن ثابت ہو جائیگا کہ ان آیات وجدانی کے سامنے غالب کی اردو شاعری کیا وزن رکھتی ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ آخر تک ٹھہرتا کون ہے
بوٹا بوٹا بن گیا ہے مرد میدانِ بہار

زمانہ کی بدمذاقی اور طوفان بے تمیزی کے دور میں ہر کس و ناکس شاعر اور لیڈر بن جاتا ہے اور تھوڑے دنوں اُس کی گرم بازاری بھی ہو جاتی ہے مگر آخر آخر تک کون ٹھہر سکے گا آخری فتح کس کی ہوگی اُس کا فیصلہ آیندہ نسلیں کریں گی۔

رنگ و بوئے عارضی سے دل بہلنے کا نہیں
فکر فردا ہے نظر میں خار دامانِ بہار

چشم بصیرت حسن ظاہری پر فریفتہ نہیں ہوتی بلکہ مال کار پر نظر رکھتی ہے۔ عالم رنگ و بو کی دل کشی مسلم مگر اہل بصیرت اس عارضی رنگ و بو کے انجام پر غور کرتے ہیں تو خلش فردا "خار دامان بہار" نظر آتی ہے۔ اندیشہ فردا کو خار دامان بہار سے استعارہ کر کے قوت متخیلہ نے کیفیت باطنی (خلش فردا) کی ایسی تصویر کھینچی جو کسی مصور سے ممکن ہی نہیں۔

اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے حال میں
کوئی حیرانِ خزاں کوئی پشیمانِ بہار

اس رنگین بیانی کے ساتھ کلام میں اتنا درد پیدا کرنا اردو لٹریچر میں مرزا

صاحب ہی کا حصہ ہے۔ بعض شعرا نے یہ شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ کلام میں مصنوعی درد پیدا کرنے کے لئے عالم نزع اور گورستان کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ نزع میں ہاتھ پاؤں کا کھچنا۔ آنکھ کا نیل ڈھل جانا۔ پیشانی پر موت کا پسینہ آجانا۔ گھرا لگ جانا۔ گھنگرو بولنا۔ گور غریباں کا سناٹا۔ قبر کی تاریکی و تنہائی وغیرہ۔ ایسے مصنوعی شاعروں کے دل میں قدرتی طور پر درد تو ہوتا نہیں وہ خارجی طور پر محض الفاظ کے ذریعہ سے نمایشی درد پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ناکامیاب رہتے ہیں دیکھو اس شعر میں شاعر نے انسانی جذبات کی مختلف تصویریں آمنے سامنے رکھ کر کتنا اہم نتیجہ نکالا ہے۔ خدا شاہد ہے کہ ان اشعار کی تخییل اور انداز بیان پر غور کرنے سے غالب کے کلام کی آب و تاب ماند نظر آنے لگتی ہے۔

دیکھ لیتا ہوں چمن کو دور سے بیگانہ وار
پاس مجھ سے کیوں کھٹکتا ہے نگہبان بہار

چمن کو دور سے بیگانہ وار دیکھ لینا اور بیگانہ وار دیکھنے پر بھی نگہبان بہار کے دل میں کھٹکا پیدا ہونا جذبات کی کتنی درد انگیز تصویر ہے۔ غزل کو اوّل سے آخر تک پڑھ جاؤ اور اُردو لٹریچر میں تلاش کرو۔ شاید ہی کہیں یہ روز قلم نظر آئے۔ سودا و میر۔ غالب و آتش کے دواوین میں کوئی ایسا مکمل نمونہ نہ دیکھو گے۔ البتہ اسی زمین میں آتش کے ہاں تین چار شعر ایسے ملیں گے جو آپ اپنی مثال ہیں ؞

ہنستا ہے عشق مجھ کو گرانبار دیکھ کر
زندانِ آب و گل میں گرفتار دیکھ کر

فطرت انسانی ایک پاکیزہ جوہر ہے۔ انسان جب کبھی اپنی روحانی جھلک دیکھ لیتا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے انسانیت کے حقیقی سر چشمہ سے نزدیک تر ہو جاتا ہے۔ اور اپنے حسن حقیقی کے مشاہدے سے وجد میں آجاتا ہے۔ بعد ازاں جب وہ اپنے جوہر گراں مایہ کو مادی کثافتوں میں آلودہ پاتا ہے تو زندان آب و گل کا عرصہ اُس پر تنگ ہو جاتا ہے ہنستا ہے عشق، اس سے ثابت ہے کہ عشق مادی کثافتوں سے کتنا بیزار ہے۔ میر و غالب کی غزلیں بھی اس زمین میں ملاحظہ ہوں کثرتِ مضامینِ تازہ اور فصاحت و بلاغت کی معجز نمائی جو اس غزل میں ہے وہ کہیں نہ پا دیکھے۔

تیور بجھے ہیں صبح کے آثار دیکھ کر
آنکھیں کھلی ہیں فتنۂ بیدار دیکھ کر

ہر شام کے لئے صبح ہر سکون و راحت کے بعد اضطراب رنج و غم لازم ہے۔ عیش و کامرانی کا زمانہ تو ہنستے کھیلتے گزر گیا۔ اب شب کی صبح نمودار ہوئی تو بجھے ہوئے دل بجھے ہوئے تیوروں سے انقلاب دہر کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ وہی دل جو سکون و راحت کا گھر تھا وہی زندگی جس کا ہر لمحہ امن و عافیت سے گزرتا تھا ہزاروں فتنہ و آشوب سے لبریز ہے۔ خواب غفلت سے چونکتے ہی قیامت کا سامنا تھا شب عیش کی صبح قیامت کی صبح تھی۔

عبرت سرائے دہر سے منہ موڑنا پڑا
آنکھوں کو اپنے در پئے آزار دیکھ کر

تماشائے عبرت سے دل کو صدمہ پہنچتا ہے اور اس صدمہ کا سبب نگاہ عبرت ہے۔ اگر نگاہ عبرت نہ ہو تو سخت سے سخت حادثے ناقابل توجہ معلوم ہوتے ہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ زمانے کے انقلاب و حوادث سے دل کو جو ایذائیں پہنچتی ہیں وہ خود اپنے احساس اپنی نگاہ عبرت کا نتیجہ ہیں مگر انسان نہ اپنی نگاہ عبرت کو بدل سکتا ہے نہ زمانے کے انقلابات پر دسترس ہے پھر چارۂ کار اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ عبرت سرائے دہر کی طرف آنکھ اٹھانے کی زحمت ہی گوارا نہ کرے بالکل کنارہ کشی اختیار کرلے۔

کس کل پہ ہے بنائے طلسمات آب و گل
اہل نظر ہیں نقش بدیوار دیکھ کر

طلسمات آب و گل کے مقابلہ میں نقش بدیوار کے لفظ سے استعجاب و حیرت کی مجسم تصویر کھنچ گئی ہے۔ ان جذبات حکیمانہ کو اردو کے معلّیٰ میں قلمبند کر دینا کاری داد

شانہ ہلا کے موت نے چونکا دیا مجھے
محو طلسم بندیِ اسرار دیکھ کر

زندگی میں اسرار حقیقت کھل نہ سکے۔ آنکھ بند ہوئی اور طلسم اسرار ٹوٹ گیا موت نے آکر حقیقت سے اسطرح آگاہ کر دیا جیسے کوئی شانہ ہلا کر سوتے سے جگا دے۔

آخر اجل نے روح کو آزاد کر دیا
احسانِ بے سبب سے گرانبار دیکھ کر

انسان کو خلعت ہستی یعنی چند روزہ زندگی ملنے کو مل گئی مگر اُس کی روح اس احسان بے سبب سے بے چین تھی قالب خاکی کا بار ناگوار خاطر تھا آخر کار اجل نے اس خواہ مخواہ کی گرانباریِ احسان سے آزاد کر دیا۔ قالب خاکی میں روح کا گھبرانا کوئی نئی بات نہیں ہے مگر مصنف نے اس ہستی چند روزہ کو احسان بے سبب سے تعبیر کر کے پرانے مضمون میں تازہ جان ڈالی ہے۔

روز ازل سے منزل سودا ہو جس کا سر
وہ کیوں نہ غش ہو سنگِ در یار دیکھ کر

سر میں سودا سمانا تو پرانا محاورہ ہے مگر سر کو منزل سودا کہنا تازہ تصرف ہے جس کی مثال غالب کے ہاں بھی نہیں مل سکتی۔ 'منزل سودا' اور 'سنگ در یار' کا معنوی تعلق اور مجموعی حیثیت سے کلام کی رنگینی و دلکشی دیکھنے کے قابل ہے۔

منزل کو اپنے زیر قدم جانتے ہیں ہم
اس توسن خیال کی رفتار دیکھ کر

دیکھئے خیال کی سُرعتِ رفتار سے کیا نتیجہ نکالا ہے۔ شعر پڑھتے ہی سلسلہ خیال کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ رفتار خیال کے مسئلہ پر فلسفہ اور سائنس کی بیش بہا تصانیف موجود ہیں۔ مگر اس شعر کا اجمالی لطف بیسیوں کتاب پر بھاری ہے۔

پیدا نہ ہو زمین سے نیا آسمان کوئی
دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر

اردو اور فارسی کا لٹریچر تو کیا دنیا کا کوئی لٹریچر اس شعر کا جواب شاید ہی پیش کر سکے۔ مرزا صاحب کے انہیں اشعار نے دیوان غالب کو نگاہوں سے گرا دیا ہے ٹگور کی دنیا بھر میں دھوم مچی ہوئی ہے۔ کاش اس شعر کا جواب کلام ٹگور میں مل سکتا۔

چلتی ہے کس طرف کی ہوا پچھلی رات سے
حیران ہے شمع صورت بیمار دیکھ کر

'کس طرف کی ہوا' کی بلاغت کا کیا کہنا۔ یہ وہ ہوائے غیب ہے جو صبح ہوتے ہوتے شمع اور بیمار جان بلب دونوں کا خاتمہ کر دے گی۔

کیوں انقلاب عشق یہ کیسی ہوا چلی؟
جی سن سے ہو گیا رخ بیمار دیکھ کر

انقلاب عشق سے تخاطب ملاحظہ کیجئے۔ 'جی سن سے ہو گیا' یہ تو وہ ناوک بے پناہ ہے جس کی داد نہ فریاد۔ انقلاب عشق کی کتنی درد انگیز تصویر ہے۔

پاتی نہیں مزاج دوا کا اثر ہو گیا؟
منہ پھیر لیتے ہیں ترے بیمار دیکھ کر

بیمار کے انداز مزاج کی ایسی ہو بہو تصویر اردو لٹریچر شاید ہی پیش کر سکے۔ اُردو میں خدائے سخن میر انیس کے بعد اور کسی کو یہ زبان عطا نہیں ہوئی 'پاتی نہیں مزاج' 'منہ پھیر لیتے ہیں' ان الفاظ نے محاکات کو کس درجہ کمال پر پہنچا دیا ہے۔

رُت پھر چلی ہے آپ کے بیمار ہجر کی
صبح بہار حشر کے آثار دیکھ کر
بٹھلاتے ہیں وہ سایہ خورشید حشر میں
عاشق کو اپنے تشنہ دیدار دیکھ کر

جنس وفا نہ تھی کوئی مفلس کا مال تھا
دل ہٹ گیا نگاہ خریدار دیکھ کر

جنس وفا کی نا قدری و کساد بازاری اور اہل وفا کی دل شکستگی کا کتنا دردناک مرقع ہے شعر وہی ہے جو قلم سے نکلتے ہی زبانوں پر جاری ہو جاتے۔

ناگفتنی ہے حضرت دل کون سی وہ بات
کیا یاد آ گیا رسن و دار دیکھ کر

دل مجھ سے پوچھتا ہے کہ تو کس طرف کو ہے
جوشِ جہادِ کافر دیندار دیکھ کر
غیرت سے رنگ نامہ اعمال اڑ نہ جائے
کیفیتِ نگاہِ گنہگار دیکھ کر

آئینہ رکھ کے آپ بھی سجدے میں جھک گئے
اب کیا کہیں گے کافر دیندار دیکھ کر

گردن ہی اپنی جب کسی قابل نہ ہوگی یاس
پھر کیا بڑھے گا دل رسن و دار دیکھ کر

ان اشعار گراں مایہ کی توضیح و تشریح یا تعریف میں قلم فرسائی کرنا ان کی توہین ہے۔ یہ ایسے نازک پھول ہیں جنہیں ہاتھ لگانا ہی سوء ادب ہے۔ ان اشعار کا غور سے مطالعہ کرو تو آپ سے آپ ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ ارتقائے شاعری کا اطلاق ان اشعار پر ہو سکتا ہے یا کلام غالب پر۔

چونکا ہوں خواب سے ابھی محفل یار دیکھ کر
سکتے میں ہوں دو رنگی لیل و نہار دیکھ کر

اڑتے ہیں ہوش گردش لیل و نہار دیکھ کر
آج وہی قفس ہے پھر سیر بہار دیکھ کر

مناظر انقلاب و کیفیات نفسی کے کیا عبرت خیز مرقعے ہیں۔

سیرِ بہارِ آخری پھر کہیں یاد آنہ جائے
ٹپکیں گے سر قفس پہ ہم پھولوں کا ہار دیکھ کر

یہ قافیہ ایسا پامال و مبتذل تھا کہ حسینوں کے گلے کے تازے یا باسی ہار یا اسی قسم کے اور چھچھورے مضامین کے سوا کوئی پاکیزہ مضمون عام ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ مگر مصنف کے مذاقِ صحیح اور اُس کی فکرِ رسا کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس چھچھورے قافیے کو اتنا روشن کر دیا۔ قفس پر پھولوں کا ہار ڈال دینے کا دستور ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ بلبل پھولوں کی خوشبو سے مست ہو کر قفس میں چہچہانے لگے اس شعر میں مصنف نے اسیرِ قفس کے ایک ایسے جذبہ کی ترجمانی میں کمال دکھایا ہے جو عام نگاہوں سے پوشیدہ رہتا ہے اسیرِ قفس صیاد سے یوں خطاب کرتا ہے کہ کہیں ایسا غضب نہ ہو کہ تو میرے قفس پر پھولوں کا ہار ڈال دے اور بہارِ آخری کی سیر یاد آ کر میرے دل کو تڑپانے لگے اور میں فرطِ اضطراب سے قفس پر سر ٹپکنے لگوں۔ پھولوں کی خوشبو سے مست ہونا تو کجا میں یادِ چمن سے بے قرار ہو کر سر ٹکرانے لگوں گا۔ دیکھو اس مبتذل قافیے سے کتنا دردانگیز مضمون پیدا کیا ہے۔

عالمِ شوق میں اسیر ہو گئے باہر آپ سے
چل بسے آمد آمدِ فصلِ بہار دیکھ کر

فصلِ بہار کی آمد آمد سُن کر اسیرانِ قفس عالمِ شوق میں آپ سے ایسے باہر ہوئے کہ شادیٔ مرگ ہو گئے۔

مستوں کی خاک کو فلک اپنے کرم سے رکھ معاف
بھٹکے گی روح سایۂ ابر بہار دیکھ کر

سایۂ ابر بہار دیکھ کر آسودگانِ زیرِ خاک کی روحوں کے بھٹکنے کا کیا درد انگیز تصور ہے۔ اس کے بعد فلک کو مخاطب کرتا ہے کہ تو اپنے کرم سے معاف رکھ۔ تیرا یہ کرم بھی (ابرِ بہار) کی آمد مستوں کی روح پر ستم ڈھائے گا۔

ہول یہی ہے ساقیا مستوں کا دم نہ نکل جائے
صبح کو تیری آنکھ میں کیفِ خمار دیکھ کر

معاذاللہ صبح کو ساقی کی آنکھوں کا خمار کتنا دل شکن نظارہ ہے۔ کہاں تو شب کی وہ سرمستیاں اور کہاں صبح کا یہ عالمِ خمار و افسردگی۔ اس نظارہ روح فرسا سے مستوں کا دم نکل جائے تو کیا عجب ہے۔ اس اندیشہ خمار سے مستوں کو ہول آتا ہے کہ دیکھئے صبح تک جان پر کیسی بنے۔ اگر اور کوئی ہوتا تو ہول کی جگہ خوف کہہ دیتا۔ مگر ایک صحیح المذاق شاعر سے بڑھ کر مترادف الفاظ کے تفاوتِ معنوی کو کون سمجھ سکتا ہے۔

کاش مرا چراغ زیست قبل سحر خموش ہو
آنکھیں نہ جانے کیا دکھائیں محفل یار دیکھ کر

جو لوگ محض موت کی ہچکیوں اور گورِ غریباں کے سناٹے کا عالم دکھا کر

کلام میں مصنوعی درد پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ دیکھیں کہ کلام میں سچا درد کیونکر پیدا ہوتا ہے۔

ایسی پلا کہ ساقیا فکر نہ ہو نجات کی
نشہ کہیں اُتر نہ جائے روز شمار دیکھ کر

کلام وہ کہ ایک ایک لفظ پر شاعرانہ وجد آئے۔ سننے والا عالم محسوسات سے گذر کر کسی اور ہی عالم میں پہنچ جائے۔

آئینہ سکندری جام جم اور قلب صاف
آنکھوں سے آج گر گئے روئے نگار دیکھ کر

آئینہ سکندری اور جام جم تو کیا مال ہے تجلّی حسن نے قلب صافی کی آب و تاب کو بھی ماند کر دیا۔

آنکھیں دکھاتے ہیں حباب چشم ہوس کو بار بار
محو طلسم بندی نقش و نگار دیکھ کر

چشم ہوس جو نقش و نگار عالم کی طلسم بندی میں محو ہے اُسے حباب بار بار آنکھیں دکھاتے ہیں چشم نمائی کرتے ہیں کہ تو کس فریب میں مبتلا ہے۔ مجھے دیکھ کہ میں سراپا عبرت ہوں۔ دنیا کی ناپایداری پر غالب نے خوب خوب زور قلم دکھائے ہیں۔ مگر معنوی خوبیوں کو اس روشن بیانی کے ساتھ ادا کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔

اہل ہوس کجا۔ کجا جلوۂ صبر آزما
تاب نہ لائے غش ہوئے آخر کار دیکھ کر

اگر شعر میں طور و کلیم کے الفاظ آجاتے تو یہ بات کہاں پیدا ہوتی جو محض اشارے کنائے میں بیان کر دی گئی ہے۔

آنکھیں بھی ملتے ہیں مگر سوجھتا کچھ نہیں ہے اب
چونکے ہیں خواب سے جو ہم جلوۂ یار دیکھ کر

خواب میں جلوۂ یار کی ذرا سی جھلک دیکھ کر چونک پڑنا چشم شوق کے لئے اور غضب ہو گیا۔ اب آنکھیں مل مل کے ادھر اُدھر دیکھتے ہیں مگر وہ جلوہ کہاں۔ اب تو دنیا اندھیر نظر آنے لگی۔ اللہ اللہ کس حقیقت کو کس الہامی زبان میں ادا فرمایا ہے۔ اسی کیفیت کو ٹیگور نے بھی قلمبند کیا ہے کہتا ہے:۔

Light, Oh where is the light. Kindle it with burning fire of desire. A moment a flash of lightning drags down deeper gloom on my sight and my heart gropes on the path to where the music of light calls me.

ٹیگور نے بھی اس کیفیت کو پُر زور الفاظ میں بیان کیا ہے مگر اس طولانی عبارت کے سامنے مرزا یاس کے دو مصرعوں پر غور کرو اور پھر دونوں سخنوروں کے احساسات

اور اندازِ بیان کے متعلق رائے قائم کرو۔

جلوۂ یار دیکھ کر خواب سے چونک اُٹھنا۔ گھبرا گھبرا کے آنکھیں ملنا اِدھر اُدھر دیکھنا اور کچھ نہ سوجھنا ان مختصر و جامع الفاظ کے ساتھ ٹگور کی عبارت آرائی ملاحظہ ہو۔ مرزا یاس کے ہاں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو ذوقِ صحیح پر گراں گزرے برخلاف اس کے ٹگور کے ہاں (music of light) ایک بے معنی استعارہ ہے۔ اس قسم کے بے معنی استعاروں کی اُن کے ہاں بھرمار ہے اور بدمذاقی سے آج کل ایسے ہی بے معنی استعاروں کا تتبع کیا جا رہا ہے۔ روشنی کا استعارہ اُنہیں چیزوں سے کیا جا سکتا ہے جو آنکھوں سے محسوس ہو سکیں۔ موسیقی کا تعلق آنکھوں سے تو ہے نہیں پھر روشنی کو موسیقی سے استعارہ کرنا عقل و فہم کے دائرہ سے باہر نہیں تو کیا ہے۔

آبلہ پا نکل گئے کانٹوں کو روندتے ہوئے
سوجھا پھر آنکھ سے نہ کچھ منزلِ یار دیکھ کر

بھلا اس جوش و خروش اس واقعیت اس صداقت کا جواب غالب کے یا ٹگور کے ہاں کیا مل سکے گا۔ آبلہ پا نکل گئے۔ کانٹوں کو روندتے ہوئے۔ شوقِ منزلِ محبوب کی کتنی بے مثل تصویر ہے۔

منظرِ یاس نے تمہیں آج لہو رُلا دیا
شعلۂ دل بھڑک اُٹھا شمعِ مزار دیکھ کر

جن لوگوں نے یوروپ کی اندھی تقلید میں محض مرئیات کی مصوری کو شاعری

کا منتہائے کمال سمجھ لیا ہے جن کے نزدیک چڑیاں چوں چوں کرتی ہیں۔ کوّے قاوں قاوں کرتے ہیں۔ اُلّو بول رہا ہے۔ مینڈک ٹرّا رہے ہیں۔ جھینگر جھنجھنا رہے ہیں اور اسی قسم کے ہزاروں خرافات کمال سخنوری کی دلیل ہیں اور جو نہایت دیدہ دلیری و شوخ چشمی سے غزل گوئی کے خلاف جہاد پر آمادہ ہیں وہ مرزا یاس کے ان آیات وجدانی پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور گریبان میں منہ ڈالیں۔ کیا وجدانی دنیا کی ایسی زندہ تصویریں کبھی فنا ہو سکتی ہیں۔

رہے دنیا میں محکوم دل بے مدعا ہو کر
خوشا انجام اُٹھے بھی تو محروم دعا ہو کر

مصنف کی بیدلانہ زندگی اور شان بے نیازی کا فوٹو اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کہ وہ دنیا سے محروم دُعا اُٹھنے کو بھی خوشا انجام کہہ کر یاد کرتا ہے مرنے کے بعد دوست احباب نے دعائے خیر سے بھی محروم رکھا تو یہ بھی بُرا نہ ہوا اُنکے احسان سے بچے۔

وطن کو چھوڑ کر جس زمین کو میں نے عزّت دی
وہی اب خون کی پیاسی ہوئی ہے کربلا ہو کر

اللہ اللہ۔ بدنصیب و ناعاقبت اندیش لکھنؤ نے اس یگانہ روزگار کے ساتھ کیا کیا سلوک کیے۔ لکھنؤ کے آسمان و زمین گواہ ہیں کہ مرزا یاس نے حاسدان لکھنؤ کے مظالم کس ہمت و استقلال سے برداشت کیے۔

بتاؤ ایسے بندے پر ہنسی آئے کہ غیظ آئے
دعا مانگے مصیبت میں جو قصداً مبتلا ہو کر

سبحان اللہ اس شوخی کلام کی کیا داد دی جائے۔ مرزا غالب نے بھی کیا خوب فرمایا ہے ؂

زندگی اپنی اسی طرح جو گذری غالبؔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مگر دونوں سخنوروں کے مطمح نظر میں بڑا فرق ہے۔ مرزا غالب خدا کی شکایت کرتے ہیں جو گستاخی کی حد کو پہنچ جاتی ہے برخلاف اس کے مرزا یاس صاحب نے بندہ کی بوالعجبی دکھائی ہے کہ کمبخت اپنے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اور پھر خدا سے دعائیں مانگتا ہے اس تماشے پر کچھ ہنسی بھی آتی ہے اور کچھ غیظ بھی۔

(فریب مے کیونکر کھلا) کھلا آخر فریبِ مے چلا جب دُرد کا ساغر
بندھا زور خمار اندیشہ روز جزا ہو کر

دور آخر کی کیا عبرت ناک کیفیت دکھائی ہے جب تک شراب کا دور چل رہا تھا اُس وقت تک تو دنیا و عقبیٰ کی کوئی خبر نہ تھی مگر جب تلچھٹ کی باری آئی تو آنکھیں کھلیں اور اب خمار کا زور ایسا بندھا کہ روز جزا کا نقشہ پیش نظر آگیا واہ کیا آغاز تھا اور کیا انجام۔ تہذیب اخلاق کے لئے اس سے بہتر سبق اور کیا ہوگا۔

(خواب غفلت سے چونکنا دوبارہ زندگی ہے) نگاہ یاس ہیں گویا دوبارہ زندگی پائی
جو چونکا خواب غفلت کے مزے سے آشنا ہو کر

خواب غفلت کے مزے میں پڑ کر ہوشیار ہونا اور راہ راست پر آجانا ایسی

دولت ہے جو معدودے چند خوش نصیبوں کو میسر آتی ہے۔ اس بیداری و سلامت روی کو شاعر دوبارہ زندگی پانے سے تعبیر کرتا ہے اور یہ تخییل مصنف ہی کا حصہ ہے غالب پر اس تازگی تخیل کی چھینٹ تک نہیں پڑی۔

دل مرا دُکھتا ہے خار و گُل کو باہم دیکھ کر
دیدنی نادیدنی دونوں کو توام دیکھ کر

اگرچہ خار و گل۔ خوب و زشت کی یکجائی قدرت کی مصلحت آمیز حکمت سے خالی نہیں مگر اس پر بھی بعض اوقات فطرت انسانی خوب و زشت کو باہم دیکھ کر ایک قسم کی ناگوار خلش محسوس کرنے پر مجبور ہے۔ دنیا میں کونسا دل ہے جو سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی کو زنگیان حبش، سے ہم آغوش دیکھ کر کارفرمایان قضا و قدر کی بوالعجبی پر حیران نہ رہ جائے۔

ہنستے ہیں افسردہ دل نیرنگ عالم دیکھ کر
اہل دل کو مبتلائے شادی و غم دیکھ کر

آنکھ والے راہ میں حیرت کی تپلی بن گئے
کچھ نہ سوجھا نمائے کے تپلوں کا عالم دیکھ کر

رنگ کے تپلوں کا عالم،

دیکھو غالب کے بعد اُردو کی شاعری ارتقا کی منزلیں طے کرتی ہوئی کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ ایک ایک لفظ میں دنیائے معانی نظر آتی ہے۔

گرد کے ہمراہ رنگ عارضی بھی ڈھل گیا
روئے گل ہے غرق خجلت فیضِ شبنم دیکھ کر

(افراطِ حسن کا اثر)

واہ ری وارفتگی جاتی رہی سب بھوک پیاس
چشم بلبل سے گلوں کو غرق شبنم دیکھ کر

ذوق نظر شرط ہے۔ نگاہ شوق سے حسن کا مطالعہ کرو تو بھوک پیاس جاتی رہے۔

(گرمی کا اثر)

رنگ لائی گرم بازاری ہوائے گرم کی
روئے گل تونسا ہوا ہے قحط شبنم دیکھ کر

اس رنگین بیانی و معنی آفرینی کا کیا ٹھکانا ہے۔ ہوائے گرم کی گرم بازاری سے روئے گل کا تونس جانا زور بیان کا معجزہ ہے معجزہ

(تصویر غم)

نقش بر دیوار زنداں ہیں اسیران بلا
چپ لگی ہے دل میں اک ہنگامۂ غم دیکھ کر

گرفتاران بلا کے سکوتِ غمناک کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ دل بیقرار ہو جائے

اُس طرف سارا جہاں اور اس طرف اک ناتوان
تم نے کروٹ تک نہ لی دنیا کو برہم دیکھ کر

لکھنؤ اور حسد شعاران لکھنؤ کے وہ ہنگامے بھی یاد ہیں کہ مرزا صاحب تنہا ایک طرف اور سارا شہر ایک طرف۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ لکھنؤ کے ذمہ دار

اور ذی اثر حضرات دور سے یہ تماشے دیکھتے رہے کسی غیرت دار کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ اخلاقی دباؤ ڈال کر اہل وطن کو اُن کی نامردانہ حرکتوں سے روکتا۔

صلح کر لی چرخ نے آخر دل مظلوم سے
انتقام حشر کے آثار پیہم دیکھ کر
حد کو پہنچا کر رہیگا پائے نافرمان مجھے
سُست پڑنے کا نہیں زنجیر محکم دیکھ کر
منزل موہوم ضد سی دور کھچتی ہی گئی
گرم رفتارِ مؤخر کو مقدم دیکھ کر

بعض وقت انسان اپنی ہوس کی بدولت ایسا مارا پڑتا ہے کہ ہستی گم ہو جاتی ہے۔ ساری گرم رفتاری ہوا ہو جاتی ہے۔ ترقی کی دوڑ میں ایک قوم دوسری پر سبقت لے جانا چاہتی ہے۔ جرمنی نے دوسروں پر سبقت لے جانے میں کیا کیا گرم رفتاری دکھائی گزشتہ جنگ کے دوران میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی تمام قوموں پر سبقت لے جائے گا مگر نتیجہ کیا ہُوا؟ منزل مقصود دور ہی کھچتی گئی اور ایسا مارا پڑا کہ الٰہی توبہ۔

(شوق منزل)

بیخودی میں آبلہ پا بھی بگولے بن گئے
منزل موہوم کو شاہد مجسم دیکھ کر

آبلہ پایوں کی بیخودی و دیوانگی کی تصویر ملاحظہ ہو۔ شوق منزل میں بگولے کی طرح زمین پر پاؤں نہیں رکھتے گویا منزل موہوم مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے اور فرط شوق میں انہیں کچھ نہیں سجھائی دیتا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔

انتظامِ قدرت خاموش آڑے آگیا
شعلہ و پروانہ کی وہ جنگ پیہم دیکھ کر

شعلہ و پروانہ کی کشمکش کو جنگ پیہم سے تعبیر کرنا بجائے خود ایک کارنامہ ہے مگر شاعر کا قلم اُس پر اور اضافہ کرتا ہے یعنی ہوا ے غیب کا ایسا جھونکا آیا کہ شمع و پروانہ کی جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ یہ ہے انتظام قدرت خاموش کا آڑے آجانا

درد دل یاس آپ کیا روئے در و دیوار سے
چھیڑنا تھا قصۂ غم گوشِ محرم دیکھ کر

*

قفس میں بوئے مستانہ بھی آئی دردِ سر ہو کر
نوید ناگہاں پہنچی ہے مرگ منتظر ہو کر

یہ غزل مرزا صاحب کے ماسٹر پیس میں داخل ہے۔ الہ آباد میں ۱۷۔ فروری سنہ ۱۹۲۶ کو دیوان رادھے ناتھ صاحب کول گلشن کی کوٹھی پر سر تیج بہادر سپرو کی صدارت میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا تھا۔ بیسویں صدی میں ایسی پاکیزہ ادبی مجلس کہیں دیکھنے میں نہ آئی سارا مشاعرہ قریباً دو ہزار تعلیم یافتہ حضرات اور سرکاری حکام سے معمور تھا۔ دیکھئے مطلع کن وجدانی کیفیتوں پر لبریز ہے۔ قفس میں پھولوں کی بوئے مستانہ اسیروں کے لئے مژدہ بہار تو ضرور ہے مگر اسی کے ساتھ باعث دردِ سر بلکہ وبالِ جان بھی ہے۔ نوید بہار پہنچی تو کیونکر پہنچی ؟ مرگ منتظر ہو کر

اسیران قفس زندگی سے تنگ آکر موت کے منتظر تھے۔ موت آئی تو کس بھیس میں بوئے مستانہ اور نوید ناگہاں کے بھیس میں۔ اس نوید ناگہاں نے اسیروں کو آپے سے باہر کر دیا۔ رہائی تو نصیب نہ ہوئی نکہت گل سے وارفتہ ہو کر دنیا سے چل بسے۔

نگاہ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دھڑکتا ہے
مبادا رنگ و بو اڑ جائے پامالِ نظر ہو کر

نگاہ شوق کی جذب و کشش سے خدا بچائے۔ جلوہ حسن کیسا ہی نظارہ سوز ہو دیکھنے والے آنکھوں ہی آنکھوں میں پی جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا احساس خود حُسن کو بھی ہوتا رہتا ہے اور ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں نگاہ شوق کی قوت جاذبہ سے سارا رنگ و بو ہوا نہ ہو جائے۔ ہم حیران ہیں کہ کس کس لفظ کی داد دیں۔ "کیا کیا دل دھڑکتا ہے" پر غور کریں یا "مبادا" اور "پامال نظر" کی معنویت پر۔ لوگ غالب کی فارسی ترکیبوں پر مرے جاتے ہیں۔ مرزا یاس کی معنی خیز ترکیبوں کا مطالعہ کرو اور دیکھو کہ ان فصیح و بلیغ ترکیبوں کا جواب اردو لٹریچر میں اور کہیں بھی مل سکتا ہے۔ فارسی ترکیبیں اگر معیار فصاحت سے گر گئیں (بال یک تپیدن۔ دام شنیدن تو اور ایک وہ نشیدن کہ کیا کہوں وغیرہ) تو اُن میں کتنی ہی معنوی خوبیاں ہوں اردو کے لئے ننگ ہیں۔ یہ شعر فصاحت و بلاغت کا ایسا معجزہ ہے جس پر ایشیائی شاعری جتنا ناز کرے بجا ہے۔

(تصویر انقلاب)

زمانے کی ہوا بدلی نگاہ آشنا بدلی
اُٹھے محفل سے سب بیگانہ شمع سحر ہو کر

کہاں پہ نارسائی کی ہے پروانوں کی قسمت نے
(نارسائی بخت)
پڑے ہیں منزلِ فانوس پہ بے بال و پر ہو کر ۔

منزلِ فانوس پر پروانوں کا بے بال و پر ہو کر رہ جانا' نارسائی بخت کی ایسی مثال غالب تو کیا عرفی کے ہاں ملنا بھی دشوار ہے۔ فانوس و شمع تو سب نظم کرتے ہیں مگر مصنف نے فانوس کو منزل قرار دے کر پروانوں کی نارسائی بخت کی ایسی تصویر کھینچی ہے جسے دیکھ کر بڑے سے بڑے منکروں کو شاعر کی قوتِ تخئیل کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

مقدر اُس مسافر کا طلب جسکی نہیں ہوتی ؎
نصیبوں میں ہو گمراہی گنہگارِ سفر ہو کر

جواب آیا تو کیا آیا صدائے بازگشت آئی
دہن سے آہ نکلی مبتدائے بے خبر ہو کر

آہ نارسا کو صدائے بازگشت سے تعبیر کرنا اور پھر اس کے لئے مبتدائے بے خبر' کا استعارۂ بدیع اختراع کرنا اردو شاعری کا وہ کارنامہ ہے کہ اگر غالب او ٹگور کو نصیب ہوتا تو اپنی کامیابی پر وجد کرتے۔ غالب ٹگور پر کیا موقوف ہے دنیا کے بڑے بڑے وسیع لٹریچر میں اس کی نظیر مل جائے تو بھی اُردو زبان کو مصنف کے اس شعر پر ناز ہو گا اور بجا ہو گا۔ غریبوں نے آہ کی تو سہی مگر اس کا جواب کیا ملا؟ وہی صدائے بازگشت آہ کیا تھی ایک مبتدا تھی جس کی کوئی خبر نہ نکلی اور نکلی

تو صدائے بازگشت سے اف ری ناکامی! یہ وہ آیات وجدانی ہیں جن پر مرزا صاحب کو خدائے سخن کہنا کوئی مبالغہ نہیں۔

فلک کو دیکھتا ہوں اور زمین کو آزماتا ہوں
مسافر در وطن خانہ بدوشِ رہ گزر ہو کر

شعر کی قدر و قیمت اُس غریب سے پوچھئے جو اپنے شہر و دیار میں غریب الوطن کی طرح زندگی کے دن کاٹ رہا ہو جو اپنی گلیوں میں خانہ بدوشوں کی طرح پڑا رہتا ہو جو درد کس مپرسی سے گھبرا کر آسمان کو دیکھتا ہو جو گرفتار مصیبت ہو کر آسمان و زمین کو آزما رہا ہو کہ دیکھیں میرے ساتھ کیسے سلوک کرتے ہیں، خانہ بدوش رہ گزر کی معنویت پر غور کرو اور دیکھو کہ ایسے استادانہ تصرفاتِ کبھی غالب کو بھی متیسر آئے تھے کلام میں درد پیدا کرنے کے ہزاروں اسلوب پیدا ہو سکتے ہیں بشرطیکہ شاعر کے دل میں خود بھی درد ہو فقط نزع کا عالم گورستان کا نقشہ دکھانے سے درد پیدا نہیں ہوتا۔

(تلخکامی) عدو کیا زہر دیتا ہے ہم ایسے تلخ کاموں کو
لہو کا گھونٹ اُتر جاتا ہے جب شیر و شکر ہو کر

زہر پی لینا آسان ہے مگر لہو کا گھونٹ شیر و شکر کی طرح اُتار لینا مشکل اور بہت مشکل ہے دشمن سے خطاب ہے کہ تو ہم ایسے تلخ کاموں کو زہر دے کر اپنے سر مفت کا وبال لیتا ہے۔ یہاں خود لہو کے گھونٹ پی پی کر تلخ کامی کے مزے

اُٹھا رہا ہوں۔ یہ شعر مرزا صاحب ہی کے قلم سے نکل سکتا تھا سے کہتے ہیں قال مطابق حال۔

(نوادرِ غالب)

خود اپنے خاک و خون میں لوٹ کر آلودۂ دنیا
پڑا ہے اب گڑھے میں گور کے آلودہ تر ہو کر

شہیدان ملک و ملت تو اپنے خاک و خون میں لوٹ کر دنیا سے پاک و پاکیزہ اُٹھتے ہیں مگر ایسے بھی بدنصیب ہیں جو دنیا میں آلودہ ہو کر غریبوں پر ظلم و ستم کرتے ہیں۔ اور آخرکار اپنے کیفر کردار کو پہنچتے ہیں۔ اندھیرے اُجالے کسی بڈھے بے ڈھب کے پالے پڑ گئے اُس نے کام تمام کر دیا۔ دنیا کی نجاستوں میں تو پہلے ہی سے آلودہ تھے اب اور آلودہ ہو کر گور کے گڑھے میں ڈال دئے گئے۔

خدا معلوم اس آغاز کا انجام کیا ہو گا؟
چھڑا ہے سازِ ہستی مبتدائے بے خبر ہو کر

پہلے ایک شعر مبتدائے بے خبر کے مفہوم پر آچکا ہے۔ اسی قافیہ کا دوسرا رُخ اس شعر میں دکھایا گیا ہے۔ اس مشاعرہ میں بیسیوں مشاہیر تھے مگر خبر کے قافیے کے ایسے نازک اور پُر معنی پہلو بھلا اور کسی کے ذہن میں کیا آتے۔ یہ قوت تو خدا نے عرفی ہی کو دی تھی مگر اُس کا دیوان بھی اس مبتدائے بے خبر سے خالی ہے زندگی کی ابتداء و انتہا کسی کو معلوم ہوئی نہ ہو سکے گی۔ اس فلسفہ پر اساتذہ کے ہاں ہزاروں اشعار موجود ہیں مگر اس الہامی زبان میں ایک شعر بھی نظر سے نہ گزرا۔

دیارِ بیخودی میں امتیازِ روز و شب معلوم
(بلائے بیخودی) بلا آئی ہے بادستوں پہ شام بے سحر ہو کر

رہائی کا خیال خام ہے یا کان بجتے ہیں:
اسیرو بیٹھے کیا ہو گوش بر آوازِ در ہو کر

اگلے زمانے میں ایسی دل ہلا دینے والی صدائیں میر تقی کے دل سے نکلتی تھیں پھر تو اردو کی دنیا میں سناٹا ہی سناٹا تھا مگر میر تقی کا سارا دیوان الٹ جاؤ اس درد انگیز صدا کا جواب نہ پاؤ گے اسیروں سے خطاب ہے کہ تم کس خیال خام میں درِ زندان پہ کان لگائے بیٹھے ہو شاید تمہارے کان بجتے ہیں اور تم اس امید میں ہو کہ زندان کا دروازہ اب کھلا اب کھلا۔ تمہارا دھیان کدھر ہے یہ محض خیال خام ہے۔ "بیٹھے کیا ہو" اس طنز آمیز بلاغت سے صاف مترشح ہے کہ فقط بیٹھے بیٹھے درِ زندان کھلنے کا نہیں جب تک تم خود کوئی جد و جہد نہ کرو۔ Irony

(طنز) سے کلام میں زور پیدا کرنا تو اردو لٹریچر میں مرزا صاحب ہی کا حصہ ہے۔ "گوش بر آوازِ در" کی ندرتِ ترکیب پر غور کرو۔ تو معلوم ہو کہ مصنف کو فارسی کی پُرمعنی ترکیبیں تراشنے میں کتنی بڑی قوتِ اجتہادی حاصل ہے۔ ہندوستان کے فارسی دانوں کی معلومات تو بس "گوش بر آواز" تک ہے۔ وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے ایسے لوگ محض اُدوائن کے توتے ہیں۔ کتابوں میں جو کچھ پڑھ لیا ہے اُس سے آگے نہیں قدم رکھ سکتے۔ مگر مبتداءِ فیاض سے جسے قوتِ استنباطی و اجتہادی حاصل ہے وہ بات سے بات پیدا کر لیتا ہے۔ ہندوستان میں مرزا غالب نے

بہت فارسی ترکیبیں استعمال کی ہیں مگر اُن کے ہاں فارسی ترکیبوں سے اکثر بد مذاقی کی بُو آتی ہے۔ مرزا یاس کو قوت اجتہادی کے ساتھ صحت مذاق ایسے اعلیٰ پایہ کی عطا ہوئی ہے کہ اُن کے تصرفات حسن معنوی کے ساتھ ساتھ کانوں کو بھی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ان مجتہدانہ قوتوں کے ساتھ کلام میں درد اور جوش وخروش اس قیامت کا ہے جو اُردو لٹریچر میں آپ اپنی مثال ہے۔

مبارک نام آزادی۔ سلامت دام آزادی
دعائیں دوں کسے یارب اسیر بال و پر ہوکر

جبر وقدر کے فلسفہ پر پہلے کسی شعر میں وضاحت کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے۔ آزادی کا خیال تو محض دھوکا ہی دھوکا ہے۔ اس نام نہاد آزادی کو آزادی کے نام سے موسوم کرنا ہی غلطی ہے البتہ دام آزادی کہو تو بیجا نہیں ہے کہنے کو تو ہاتھ پاؤں ملے پر پرواز بھی عطا ہوئے مگر سب اپنی حدوں میں محدود۔ یہ معنی ہیں اسیر بال و پر کے۔ اسے کہتے ہیں دام آزادی۔ کہتا ہے کہ برائے نام آزادی ملنے کو مل گئی۔ اس آزادی کا کہنا نہایت مبارک نعمت ہے۔ مگر ہے فی الحقیقت دام آزادی، خیر جو کچھ بھی ملا اس کی خیر منانا چاہیئے۔ پھر تجاہل عارفانہ کے انداز سے خدا کو (جس نے بال و پر عطا کر کے بھی مقید و مجبور کر رکھا ہے)۔ مخاطب کرتا ہے کہ اس احسان بے معنی پر کسے دعائیں دوں۔ دیکھو طنز آمیز انداز بیان (Irony) کیا قیامت ڈھا رہا ہے۔ ان معانی و مطالب کی روشنی میں اپنی مجبوریوں پر نظر کرو تو دل سے ہوک اُٹھتی ہے۔ اگر مطالعہ صحیح

کی قوت ہوتی تو قوم کی ذہینت میں نہ جانے کیا انقلاب پیدا ہوجاتا کاش غالب و ٹگور کا مطالعہ کرنے والے اس شعر کے حقیقی مفہوم تک پہنچ سکتے۔

عجب کیا وعدۂ فردا پس فردا پہ ٹل جائے
کوئی شام اور آجائے نہ شام بے سحر ہو کر

فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ کیا ایسے اشعار بھی ہندوستانی دماغوں سے نکل سکتے ہیں۔ شام بے سحر کا اندیشہ۔ وعدۂ فردا کے پس فردا پر ٹل جانے کا دھڑکا، کیا اتنے قیامت خیز و دردانگیز احساسات کو اتنے برجستہ الفاظ میں اور کسی نے بھی قلمبند کیا ہے غالب کی مسروقہ یا مستعار originality کیا اس حقیقی originality کے مقابلہ میں ٹھہر سکتی ہے؟ یہ وہ آیات وجدانی ہیں جو آج نہیں کل مرزا یاس کو خدائے سخن منوالیں تو سہی۔

نگاہ یاس کا عالم جو آگے تھا سو اب بھی ہے
ہزاروں گل کھلے بازیچۂ شام و سحر ہو کر

سبحان اللہ اپنی استقامت و پامردی کو کس انداز سے بیان فرمایا ہے فقط لکھنؤ ہی میں نہیں لکھنؤ کے باہر مرزا صاحب کے خلاف کیا کیا فتنے اُٹھے کیا کیا گل کھلے مگر ان تمام ہنگاموں کو مرزا صاحب نے بازیچہ حقیر سے زیادہ وقعت نہ دی۔ سینکڑوں جھونکے ادھر سے آئے اُدھر سے نکل گئے مگر طوفان بے تمیزی کا کوئی اثر نہ لیا۔ زمانے نے کیا کیا کروٹیں بدلیں مگر یاس جو آگے تھے وہی اب

بھی ہیں۔ بات کے دھنی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ الہ آباد میں شعرائے لکھنو کی نازیبا حرکتیں ابھی تک آنکھوں کے سامنے پھرتی ہوں گی اور مرزا یاس کے زمزمے اب تک کانوں میں گونجتے ہوں گے۔

خود پرستان ازل دارند ایمانے دگر
حق پرستی مے کنند اما بہ عنوانے دگر

باز بشکستم بزخم خود نمکدانے دگر
شکر درد خویش ادا کردم بہ عنوانے دگر

دست خود دامان خود بودن ندارد لذتے
دست گستاخی دگر خواہیم و دامانے دگر

مزہ تو جب تھا کہ دست گستاخ کسی اور کے دامن تک دراز ہوتا۔ جو دامن بچائے پھرتے ہیں اُن کی خبر لی جاتی۔ اپنے ہاتھوں اپنا ہی دامن چاک کر لیا تو کیا

جز ترنمہائے درد افزا ندارم چارۂ
بلبل تنہا نشین نیست درمانے دگر

ہیں وہ بلبل تنہا نشین ہوں کہ کنج تنہائی میں خود اپنے نغمہائے درد افزا سے

دل بہلا رہا ہوں سوا اس کے چارہ ہی کیا ہے دوسرا کوئی ہم صفیر و ہم جنس کہاں سے لاؤں کسے دردِ دل سناؤں۔

گوشم از ذوقِ اسیری برنتابد مژدہ
جان ایذا دوست دارد شوقِ زندانے دگر

شوق ایذا طلبی کی حد ملاحظہ ہو۔ کہتا ہے کہ میرے کان مژدۂ رہائی سننا گوارا نہیں کر سکتے میری جان ایذا دوست کی تمنا ہے تو یہ ہے کہ اگر ایک زندان سے رہائی ہو بھی جائے تو پھر دوسرا زندان نصیب ہو۔

پاسبانی از نگاہِ نارسا ناید دُرست
بوئے یوسف را چہ پیدا کن نگہبانے دگر

اے نگہبانِ حُسن اس خیال خام سے باز آ۔ تیری نگاہ نارسا حُسنِ یوسف کی نگہبانی کیا کر سکے گی۔ بوئے یوسف چھپائے نہیں چھپ سکتی۔

الوداع اے حسن و عشقِ کفر مشرب الوداع
ما زفیضِ بیدلی داریم ایمانے دگر

اے عشقِ کفر مشرب اے حسن کافر کیش الوداع۔ اب تمہارا جادو مجھ پر نہیں چل سکتا۔ فیضِ بیدلی نے مجھے تم سے بے نیاز کر دیا ہے حسن و عشق حقیقی نے میرا ایمان تازہ کر دیا۔ حسن ظاہری میری نگاہوں میں نہیں جچتا۔

(غفلت جاودانی)

غفلت جاوید دارد رنگِ خوابِ سرمدی
جلوۂ فردا بہ چشم ما شبستانے دگر

اللہ اللہ کتنا عبرت انگیز شعر ہے۔ غفلت جاودانی نے مجھے دنیا و عقبےٰ دونوں سے کھو یا ہیں ہوں اور اک خواب سرمدی۔ اگر صبح قیامت بھی جلوہ گر ہو تو میری نگاہوں میں اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا غفلت مآبی کی انتہا ہے۔

ہر کسے را بہرۂ باشد ز فیضانِ بہار
دست من رنگین زخار و گل بداما نے دگر

فیضان قدرت سے کوئی محروم نہیں کسی کا دامن پھولوں سے بھرا ہے۔ عیش و کامرانی کی زندگی بسر کرتا ہے مگر میرا ہاتھ بھی خالی نہ رہا پھول توڑنا چاہا تھا مگر ہاتھ نہ آیا۔ کانٹوں سے ہاتھ زخمی ہوکر رنگین ہوگئے چلو یہی سہی یہ بھی ایک فیضان بہار ہے۔ اپنا اپنا لہنا۔ اپنی اپنی قسمت شعر پر غور کرو تو دل ہاتھ سے جاتا رہے۔ اس صدی میں یہ نوائے درد اور کہیں سننے میں نہ آئی۔

زندہ در گوریم و شاید زندہ جاوید ہم
جرعۂ خوردیم یا ئس از آب حیوانے دگر

بیشک ان آیات وجدانی کو کسی زمانے میں فنا نہیں۔ اگرچہ مرزا صاحب کی زندگی ایسی تلخ گزری کہ موت کے مزے آگئے مگر حیات جاودانی جنہیں ملنے

والی ہوتی ہے اُن کی مادی زندگی عموماً تلخ گزرتی ہے۔

رباعی

تا چند فریبِ نظرِ نکشودہ　　تا کے ہوسِ بال و پرِ نکشودہ

دارد چہ عجب از پسِ پردہ خبری　　خاموش نشینے بہ درِ نکشودہ

زمین کروٹ بدلتی ہے بلائے ناگہاں ہوکر
عجب کیا سر پہ آئے پاؤں کی خاک آسماں ہوکر

مصنف نے یہ غزل نومبر ۱۹۲۵ء اپنے دوران قیام علی گڑھ میں کایستھ پاٹ شالا کالج الہ آباد کے مشاعرہ کے لئے کہی تھی۔ یہ غزل فقط مرزا صاحب ہی کا ماسٹر پیس نہیں ہے بلکہ اردو زبان میں بیسویں صدی کا ماسٹر پیس کہئے تو بجا ہے۔ اس زمین خواجہ وزیر کا مطلع مشہور ہے۔

چلا ہے او دل راحت طلب کیا شادماں ہوکر　　زمین کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہوکر

مرزا صاحب کا مطلع بھی 'آسمان' ہی کے قافئے میں ہے مگر دونوں مطلعوں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ مرزا صاحب کا مطلع بیسویں صدی کے انقلابات کا نتیجہ ہے جو مرزا صاحب ہی کے قلم سے نکل سکتا تھا۔ زمین بلائے ناگہان ہوکر 'کروٹ بدلتی ہے۔ کروٹ بدلنے کا ثبوت جو دوسرے مصرع میں دیا گیا ہے۔ (عجب کیا جو پاؤں کی خاک سر پہ آئے) وہ اک قیامت خیز زلزلہ سے کم نہیں۔ ایک ایک لفظ کے بدلے شاعر اگر جواہرات میں تول دیا جائے تو بھی انصاف کا

حق ادا نہیں ہو سکتا۔ بھلا ان نوادر بے بہا کے سامنے غالب کا دیوان لایا جا سکتا ہے۔

زبانِ دل خراش و داستانِ ظلم ارے توبہ
دہلتا ہے قفس ہنگامہ زارِ الاماں ہو کر

داستان ظلم اور وہ بھی زبان دلخراش سے سننے کی تاب کون لا سکتا ہے دل تو دل ہے قفس بھی شورِ الاماں سے ہنگامہ زار بن کر دہل رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی اسیر دردمند کی نوائے درد نے سارے اسیران قفس کو پھڑکا دیا ہے اور اس ہنگامہ اضطراب سے سارا قفس زلزلے میں ہے۔ "ہنگامہ زارِ الاماں" کے تصرف پر غور کرو اور غالب کے تصرفات سے مقابلہ کر کے مصنف کی قادر الکلامی کا اندازہ کرو۔

خزاں کے دور میں دل کی لگی بجھتی تو کیا بجھتی
ہمیں خود آشیاں سے اُڑ گئے ہوتے دھواں ہو کر

بجھتی تو کیا بجھتی کیا ان دردمندانہ احساسات کی ترجمانی اتنے پُر جوش اتنے سادہ الفاظ میں غالب سے ممکن تھی۔ خزاں میں دل لگی کیا بجھتی؟ یہی ہوتا کہ آشیانے میں آگ لگ جاتی اور اس کے ساتھ ہم بھی دھواں بن کر اُڑ جاتے پتھر کا دل بھی ہو تو ان اشعار کو سُن کر پگھل جائے۔

نویدِ خشک سُنکر جنکے مُنہ سے پھول جھڑتے تھے
چمن کو صبر کر بیٹھے وہ آخر بدگمان ہو کر

اسیرانِ بلا پہلے تو مژدۂ بہار سُن کر ایسے چہچہائے کہ مُنہ سے پھول جھڑنے لگے مگر انتظارِ رہائی کی کوئی حد بھی ہے۔ رہائی نصیب نہ ہوئی تو سمجھے کہ فصلِ گل اپنے حق میں محض نویدِ خشک تھی جس کا کوئی حاصل نہ تھا آخر کار امیدِ موہوم سے بدگمان ہو کر چمن کو صبر کر بیٹھے۔

وبالِ رنگ و بو سے چھوٹتے ہی پر نکالیں گے
گرانبارِ بہار آخر سبکدوشِ خزاں ہو کر

گلہائے رنگا رنگ جو شاخوں میں لگے ہوتے ہیں اور از خود جدا نہیں ہو سکتے اُنہیں گرانبار بہار سے تعبیر کرنا قوتِ متخیلہ کا کتنا اچھوتا نمونہ ہے۔ بادِ خزاں کے چلتے ہی یہ گرانبارِ بہار وبالِ رنگ و بو سے چھوٹتے ہی پر نکالیں گے یعنی ہوائے خزاں انہیں پر لگا دے گی اُڑ کر کہیں سے کہیں پہنچ جائیں گے۔ یہ ساری گرانباری وبالِ رنگ و بو ہی تک ہے۔ یہ وہ معنوی لطافتیں ہیں جہاں غالب کی فکر تو پہنچ سکتی تھی مگر چھوٹتے ہی پر نکالیں گے، یہ قوتِ بیان اتنی سادہ اور شیریں زبان اُنہیں کیا نصیب ہوتی۔

زمانے بھر کا مُنہ تکتے ہیں کیوں اپنی طرف دیکھیں
بسر کرنا ہے جنکو رنگ و بوئے رائگاں ہو کر

سبحان اللہ کیا جذبۂ خود شناسی ہے۔ خود اعتمادی ہو تو ایسی ہو۔ کہتا ہے کہ

دنیا کی اوندھی مت کے ہاتھوں جنہیں کس مپرسی کی زندگی بسر کرنا ہے جن کے رنگ و بو کا کوئی قدر شناس نہیں ہے وہ زمانے بھر کا منہ کیوں تکتے ہیں۔ زمانے سے قدردانی کی توقع فضول ہے انہیں چاہیئے کہ اپنی طرف دیکھیں آپ اپنی قدر کریں۔ یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو عالم بیدلی و کس مپرسی میں سہارا دیتا ہے۔ رنگ و بوئے رائگان کی ترکیب نے عالم کس مپرسی کی ایسی تصویر کھینچی ہے جس کا جواب نہیں۔

پرائے درد کی کوئی نگہبانی کرے کب تک
حقیقت کھل نہ جائے اضطراب رازداں ہو کر

اپنا درد تو مشکل سے چھپتا ہے پھر پرایا درد کوئی کب تک چھپائے۔ کہتا ہے کہ میرا درد آشنا میرا راز چھپانا تو چاہتا ہے مگر دیکھئے کب تک چھپائے رکھتا ہے۔ کہیں میرے درد میرے حال زار سے مضطرب نہ ہو جائے اور اُس کے اضطراب سے میرے سب راز افشا نہ ہو جائیں۔ مصنف نے اس نازک حقیقت کو جس سادگی سے بیان کر دیا ہے اس سے بہتر انداز بیان شاید ہی پیدا کیا جا سکے ایک خوبی یہ بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ اگر رازداں پرائے درد سے مغلوب ہو کر مضطرب ہو جائے اور کسی کا راز افشا ہو جائے تو ایسی حالت میں اس پر کوئی الزام بھی نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ اُس نے دانستہ افشائے راز نہیں کیا بلکہ اضطراب کے باعث مجبور تھا۔ مرزا صاحب کی یہ قادر الکلامی اور فکر کی یہ گہرائی قسم کھانے کے قابل ہے۔ یہ وہ مقامات شاعری ہیں جہاں غالب کا گزر نہیں۔

ہزاروں شمعیں لاکھوں دل تری محفل میں جلتے ہیں
جلیں گبر و مسلمان کیوں نہ یک دل یک زبان ہو کر

جہنم ہو کہ جنت طائر جاں تھم نہیں سکتا
کہیں پرواز کی حد مل سکیگی لامکاں ہو کر

روح مجرد قالب خاکی سے نکل کر جب لامکان ہوگئی تو پھر اُس کے لئے جہنم یا جنت یا کسی قسم کی قید مکانی محال ہے پھر اُس کی پرواز کی کوئی حد ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا روح کا جنت یا دوزخ میں محدود ہو جانا چہ معنی دارد۔

خودی کی کیفیت سے چونکتے ہی دیکھتا کیا ہوں
کہ اُترا نشۂ ہستی خمار جاوداں ہو کر

پیام غفلت جاوید ہے جلوہ حقیقت کا
سما جائے نہ آنکھوں میں کہیں خواب گراں ہو کر

ان اشعار کی کیفیات وجدانی پر کچھ اظہار خیال کرنا سخت نادانی ہے۔ بس ان کے مطالعہ سے دیدۂ دل روشن کرنا اور وظیفہ میں رکھنا چاہئے۔ اگر ہندوستان کے مقدس صحیفے دو ہیں ایک وید مقدس اور دوسرا دیوان غالب تو مرزا بسمل کے آیات وجدانی کو تیسرا صحیفہ ماننا پڑے گا۔ ان آیات وجدانی کے متعلق کوئی گفتگو کرنا بے سود ہے۔ فقط دیدۂ دل سے مطالعہ کرنا چاہئے قدرت الٰہی کے یہ وہ نمونے

ہیں۔ جن کی نسبت مرزا صائب اصفہانی کہہ گیا ہے ؎

چشم بر صنع باز کن لب را ببند
بہتر از خواندن بود دیدن خطِ اُستاد را

بہارِ لکھنؤ کو خونِ دل سے کس نے سینچا ہے
خدا لگتی بھی کہدیگا کوئی پتا زباں ہو کر

ارے او جلنے والے کاش جلنا ہی تجھے آتا
یہ جلنا کوئی جلنا ہے کہ رہ جائے دھواں ہو کر

پھڑکتے ہیں مگر بیدرد مُنہ سے کچھ نہیں کہتے
نگاہِ یاس نے مارا ہے دردِ بے زباں ہو کر

ان تینوں اشعار میں اپنی ادبی خدمت اور اہل لکھنؤ کی حسد شعاری کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ مگر اس تلخ نوائی میں بھی وہ کمال دکھایا ہے کہ ایک ایک لفظ میں شیر و شکر کی حلاوت ہے۔ خدا لگتی بھی کہہ دے گا الخ یہ جلنا کوئی جلنا ہو الخ نگاہ یاس نے مارا ہے دردِ بے زباں ہو کر۔ یہ وہ تیر و نشتر ہیں کہ دشمن کے دل مجروح کو دیر تک پھڑکنے کی آرزو رہے۔ ہائے آج غالب زندہ نہیں اس دردِ بے زبان کی داد کون دے۔

وطن کی ہے ہوا سر میں وطن کی خاک دامن پر
گریباں چاک کر لیتا ہوں یادِ دوست دشمن پر

یہ غزل مرزا صاحب نے لاہور میں فیروز پور کے مشاعرہ کے لئے کہی تھی جو ماہ مئی ۱۹۲۶ء میں منعقد ہوا تھا اگرچہ لکھنؤ کا ذرہ ذرہ مرزا صاحب کا دشمن ہے مگر پھر بھی لکھنؤ کی محبت میں دل کو قرار نہیں۔ عالم غربت میں وطن کی یاد کسے نہیں آتی مگر 'وطن کی ہے ہوا سر میں' کہنے کے بعد ہی 'وطن کی خاک دامن پر' یہ کلمہ اب تک کسی کی زبان سے نہیں سُنا اور پھر اسی کے ساتھ 'یاد دوست و دشمن پر گریبان چاک کر لینا' جذبہ 'حب وطن' کی ایسی درد انگیز تصویر شاید ہی کسی نے کھینچی ہو۔ حضرات لکھنؤ کی عداوتوں کا مزہ مرزا صاحب کے دل ایذا پسند سے بڑھ کر کون اُٹھا سکتا ہے۔

نہ ترکِ اختیار آساں نہ ضبطِ اضطرار آساں
یہی دستِ دعا جھلا کے اُٹھ جاتا تھا دشمن پر

اللہ اللہ دو مخالف جذبوں کی ترجمانی میں کیا زور قلم صرف کیا ہے۔

اختیار و اضطرار دونوں حالتوں میں انسان آپ سے باہر ہو جاتا ہے۔ اختیار تو ایک لفظ بے معنی ہے۔ انسان مجبوری و اضطرار کا مجسمہ ہے جب اُسے کسی بات پر قدرت حاصل ہوتی ہے تو اپنی سی کر گزرنے میں چوکتا نہیں اور جب مجبور ہوتا ہے تو واویلا مچاتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہی دستِ دعا جو بے بسی اور مجبوری کی حالت میں آسمان کی طرف بلند کیا گیا ہے اختیار و اقتدار کی حالت میں جھلا کر دشمن پر اُٹھ جایا کرتا تھا ع ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا ضبط اضطرار تو مشکل ہے ہی مگر ترکِ اختیار اُس سے زیادہ مشکل ہے۔ اسے کہتے ہیں

اس کا نام ہے تازگی اور تازگی بھی وہ جو واقعیت وصداقت پر مبنی ہو۔ محض دوراز کار تخییل سے کلام میں تازگی پیدا کی گئی تو کس کام کی۔ مرزا صاحب کا کلام اوّل سے آخر تک پڑھ جاؤ سراپا پاؤ گے اور کہیں بھی واقعیت سے خالی نہ ہوگا۔

پسینا تک نہیں آتا تو ایسی خشک توبہ کیا
ندامت وہ کہ دشمن کو ترس آجائے دشمن پر

بھلا ایسی توبہ ریائی کس کام کی کہ پسینا تک نہ آئے۔ ندامت تو وہ کہ دشمن کو بھی ترس آجائے۔ "پسینا تک نہ آتا" اس سے بہتر توبہ خشک کا ثبوت اور کیا ہوگا۔ کیا اس اس کی مثال غالب کے ہاں مل سکتی ہے؟

وفا پر بدگمانی کا گمان اب تک نہیں ہوتا
ہنوز اک حُسنِ ظن ہے اپنے دل کو حُسنِ بدظن پر

بدگمانی بھی حُسن کی ایک شان ہے۔ عاشق ہزار صادق الوفا ہو حسن اُس کی طرف سے بدگمان ہی رہتا ہے۔ مگر عشق کی سادہ دلی کا مقتضا یہ ہے کہ وہ حُسنِ بدظن کے ساتھ بھی حُسنِ ظن رکھتا ہے اُسے یقین نہیں آتا کہ دوست اُس کے صدق و وفا کی طرف سے بدگمان ہوگا۔ حُسن وعشق کی ذہنیت بھی عجیب وغریب ہے۔ ہر کس بہ خیال خویش خبطے دارد۔

شکستِ نشہ و کیف ندامت واہ کیا کہنا
بجائے مے ٹپکتا ہے زلال اشک دامن پر

نشہ اُتر جانے کے بعد کیف ندامت کی تصویر کتنے نرالے انداز سے کھینچی ہے یعنی وہی دامن جس پر زلال مے ٹپکتا رہتا تھا اب زلال اشک سے تر ہے۔

نگاہ بے نیازی نے دکھایا راستا سیدھا
بھٹکتا کوئی کب تک جادۂ شیخ و برہمن پر
فریب چشم احول سے ہوس دونی ہوئی دل کی
مگر کیا دسترس دنیا کے نگار رنگ خرمن پر

فلسفہ فریب نظر پر غالب کی نظر بہت گہری ہے مگر انہیں شاعری کی زبان نہیں ملی محض ٹوٹے پھوٹے الفاظ ہیں جو کچھ کہہ سکتے ہیں کہہ جاتے ہیں۔ فریب چشم احول سے دل کی ہوس تو بڑھ گئی۔ مگر دنیا کے خرمن رنگار رنگ پر دسترس نہ ہوا۔ یہ شعر میں زبانی مرزا یاس کا حصہ ہے۔ مرزا غالب کو مرزا یاس پر فضیلت ایک اعتبار سے ضرور ہے وہ یہ کہ مرزا یاس کی شاعری کا موضوع محض انسان اور انسان کی وجدانی دنیا تک محدود ہے۔ مرزا صاحب نے اپنی تمام قوت فطرت انسانی کے مطالعہ میں صرف کی ہے۔ برخلاف اس کے مرزا غالب نے فطرت انسانی کے علاوہ نظام عالم پر بھی بہت کچھ غور کیا ہے۔ اس اعتبار سے غالب کی شاعری کا دائرہ عمل زیادہ وسیع ہے۔ مگر جہاں تک انسان کی وجدانی دنیا کا تعلق ہے مرزا یاس کے مقابلہ میں اور کسی نے اتنا زور قلم نہیں دکھایا۔ اور اس کا فیصلہ ان کے کلام کے

مطالعۂ صحیح پر موقوف ہے۔

ہوئے کیوں بارِ خاطر خود بخود گلہائے پژمردہ
ڈھے پڑتے ہیں آپی آپ کیوں گلچیں کے دامن پر

گلہائے پژمردہ کا آپ سے آپ گلچین کے دامن پر گرنا اس مشاہدہ سے قوت متخیلہ نے کتنا انوکھا نتیجہ نکالا ہے یعنی خواہ مخواہ کسی کا بارِ خاطر ہونا کیا ضرور ہے۔ زمانے کی نامساعدت سے اگر انسان دنیا کی نگاہوں میں حقیر ہو جائے تو اس حالت میں بھی اپنی خودداری کا پاس ولحاظ واجب ہے۔ مرزا صاحب کی زندگی کا مشن خودداری ہے اوّل سے آخر تک یہی جھلک نمایاں ہے۔

خدا جانے اجل کو پہلے کس پر رحم آئے گا
گرفتارِ قفس پر یا گرفتارِ نشیمن پر؟

بیشک گرفتارِ قفس بھی رحم کے قابل ہیں مگر وائے برحال اُن کے جو خود اپنے نشیمن میں گرفتار ہیں جن کا نشیمن قفس سے بدتر ہے۔ ایسوں کا دردِ دل کون سمجھ سکتا ہے کہ دنیا تو گرفتاران نشیمن کے دردِ نہان سے بے خبر رہی ہے اور رہے گی۔ مگر نہ معلوم اجل کو بھی ان بدنصیبوں کے دردِ نہان پر رحم آئے گا یا نہیں؟ اگر موت بھی ان کی فریاد کو نہ پہنچی تو پھر قیامت ہے۔ میر تقی کے بعد یہ سوز و گداز مرزا یا اس کا حصّہ ہے۔

دہائی کھینچنے والو قفس سے لاگ رکھنا کیا؟
مبادا آگ برسے آنچ آجائے نشیمن پر

اسیران قفس سے خطاب ہے کہ تم اپنے سوز و گداز سے دہائیاں کھینچ کر قفس کو پھونک دینے کی فکر میں ہو مگر اس لاگ کا نتیجہ کہیں بد سے بدتر نہ ثابت ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری آہ آتشبار سے قفس کے ساتھ آشیانے پر بھی آنچ آجائے دونوں جل کر خاک ہو جائیں اگر آشیانے سے محبت رکھتے ہو تو قفس کی بھی خیر مناؤ۔

زہے معراج انسانی کہ بندہ ہوں تو اپنا ہوں
چڑھایا خود پرستی نے نگاہِ دوست و دشمن پر

مصنف نے فلسفہ خودی کے تو ایسے ایسے نکات حل کر دیئے ہیں جو اردو لٹریچر میں اب تک الشاذ کالمعدوم کے حکم میں تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جذبہ خودی ہی انسانیت کی معراج کا زینہ ہے بندہ ہوں تو اپنا ہوں بھلا اُس سے بڑھ کر انکار دوئی اور اقرار ہمہ اوست اور کیا ہوگا۔ نگاہوں پر چڑھا کر معراج انسانی کا ثبوت دینا ملاحظہ ہو۔ معنوی نزاکتیں اس روشن بیانی کے ساتھ پیدا ہوں جب کمال ہے۔ غالب کے اشعار کی طرح اگر تاویلات باردہ کی ضرورت پیش آئے تو پھر شاعری کیا ہوئی۔

کجا طرز یگانہ اور کجا انداز بیگانہ
بجا ہے لکھنو کو رشک ایسے صاحب فن پر

رباعی

دل جنکا علیل رائے بھی اُنکی علیل | باطن میں ہیں آذر اور ظاہر میں خلیل
اندھے جو ذلیل کو سمجھتے ہیں عزیز | شیطان کو عجب نہیں جو کہدیں جبریل

زحمتِ سجدہ ہے فضول بتکدۂ مجاز میں
ہو گی نماز کیا قبول کعبہ خانہ ساز میں

یہ غزل مرزا صاحب کے ماسٹر پیس میں داخل ہے جو ۱۹۲۳ء میں بمقام لکھنو اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کے سالانہ مشاعرہ کے لئے کہی گئی تھی مگر اتفاق ایسا ہوا کہ مرزا صاحب اس مشاعرہ میں جا نہ سکے۔

انسان نے اپنی ہوائے نفس یا کوتاہ نظری سے بتکدۂ مجاز کو کعبہ مقصود بنا لیا مگر ایسے کعبہ خانہ ساز میں زحمت سجدہ کا حاصل کیا۔ عالم مجاز کو بتکدہ اور کعبہ خانہ ساز سے تعبیر کر کے کمال قوت اختراعی کی داد دی ہے۔

دیکھ کے حُسنِ خوب و زشت انجمنِ مجاز میں
ہوش و خرد ہیں مبتلا زحمتِ امتیاز میں

خوب و زشت تو محض اعتباری الفاظ ہیں۔ ایک ہی چیز ہے جو بعض اعتبار سے خوب اور بعض اعتبار سے زشت نظر آتی ہے۔ خوب تو خوب ہے ہی۔ زشت جسے کہتے ہیں وہ بھی نگاہ عارف میں حُسن رکھتا ہے۔ قدرت کی اس بوالعجبی نے اہل ہوش کو زحمت امتیاز میں مبتلا کر رکھا ہے ان کی نگاہ میں

کوئی شے اپنے مفہوم مطلق کے اعتبار سے ہمہ تن خوب یا سراپا زشت نظر نہیں آتی۔

مارے پڑے ہیں بوالہوس جلوہ گہ مجاز میں
کھائی شکست کوششِ فتحِ طلسم راز میں

واہ رے مطمح نظر واہ رہی سیر مختصر
کعبہ سے دیر کا سفر زندگی دراز میں

خانہ کعبہ الفراق۔ قبرِ حسین الوداع
رہ چکے ہم عراق میں بس چکے ہم حجاز میں

حسرتِ بال و پر بڑھی لہر سی دوڑنے لگی
بوئے قفس نواز سے طبع ہوس نواز میں

وعدۂ دلفریب یا مژدۂ بعدِ وقت سے
آئے گا انقلاب کیا خاطر بے نیاز میں

نفس سے گفتگوئے صلح جنگ خلافِ مصلحت
کوئی نہ کوئی فیہ ہے عقل زمانہ ساز میں

زمانہ سازوں کی ذہنیت کی طرف اشارہ ہے کہ نفس کو دبانا نفس سے جنگ کرنا خلاف مصلحت سمجھ کر صلح کر لیتے ہیں حالانکہ نفس سے صلح کرنا خود اپنی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ مذہب و اخلاق کی تعلیم تو یہ ہے کہ نفس سے ہمیشہ برسر جنگ رہنا اور اسے دبائے رکھنا چاہیے مگر زمانہ سازوں کی کمزوری نفس سے

جنگ کرنے کی تاب نہیں لاتی - یہ اُن کی عقل کا فتور ہے۔

داورِ حشر ہوشیار دونوں میں امتیاز رکھ
بندۂ نا اُمید اور بندۂ بے نیاز میں

یہاں شاعر نے بندگانہ و طفلانہ شوخی سے داورِ حشر کو مخاطب کیا ہے کہ اے میرے مالک بندۂ نا امید اور بندۂ بے نیاز میں امتیاز رکھنا تیرا وہ بندہ (جو تیرے فضل و کرم پر بھروسا کر کے) شان بے نیازی دکھاتا ہے تیرے اُس بندے سے کہیں بہتر ہے جو تیری رحمتوں سے نا امید اور تیری عنایتوں کا قائل نہیں ہے۔ نا امیدی وہ جرم ہے جو کبھی قابل عفو نہیں اور بندہ کی شان بے نیازی تو محض ایک طفلانہ شوخی یا لاڈلا پن ہے ایسا بندہ مستوجب غضب نہیں ہو سکتا۔ سبحان اللہ اس بندگانہ گستاخی و طفلانہ شوخی میں کیا شان عبودیت پنہاں ہے۔ ذرا سوچو تو سہی کہ اس شعر کے مقابلہ میں غالب کا یہ شعر کیا وزن رکھتا ہے ؎

زندگی اپنی اسی طرح جو گزری غالب ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

ہوتا ہے بند ایک در کھلتے ہیں صد ہزار در
اپنی طرف سے شک نہ کر نیت کارساز میں

بعض وقت انسان فرطِ نا امیدی و مایوسی میں خدا کے فضل و کرم کی طرف سے بدگمان ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں مرزا صاحب کا یہ مصرع ؎ (اپنی طرف سے شک نہ کر نیت کارساز میں) پیش نظر ہو جائے اور انسان غور کرے تو خوف کے

مارے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں کہ واقعی ناامید ہونے کے معنی تو یہ ہوئے کہ ہمیں ربوبیت کارسازی میں شک ہے اس کی عنایت پر بھروسا نہیں ہے۔ شان بندگی و عبودیت تو یہ ہے کہ بندہ اپنے مالک کی ربوبیت کارسازی پر یقین کامل رکھے ایک در بند ہوتا ہے سو در کھلتے ہیں۔ سبحان اللہ خدا پر یقین کامل رکھنے کی کتنی صحیح تعلیم دی ہے۔

بندۂ خود شناس ہی اپنے ہی پیرہن میں مست
بوئے خودی کو دخل کیا پیشگہ ایاز میں

محمود و ایاز کے عشق و محبت کا مضمون اتنا پامال ہے جس میں تازگی پیدا کرنا اب بہت دشوار ہے مگر اہل نظر داد دیں گے کہ مصنف نے اس پامال مضمون میں 'بندۂ خود شناس' اور 'اپنے ہی پیرہن میں مست' کے پُر معنی تصرفات سے کیا تازہ روح پھونک دی۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں صاحبانِ فکر و اجتہاد کا جی چھوٹ جاتا ہے۔ اس مضمون خاص پر اُردو لٹریچر میں دو شعر یادگار ہیں ایک تو مرزا صاحب کا مذکور الصدر شعر اور دوسرا خواجہ آتش کا یہ شعر ؎

سودائے عشق میں نہ رہی شانِ خواجگی　　محمود بندہ ہوگیا حُسنِ ایاز کا

خواجہ آتش رحمۃ اللہ علیہ نے محمود غزنوی کی وارفتگی شوق کا نقشہ کھینچکر قلم توڑ دیا ہے اور مرزا صاحب نے ایاز فارِ خودشناس، کے مفہوم کو تازہ و پُرکیف الفاظ کا لباس پہنا کر کمال سخنوری کا حق ادا کر دیا ہے۔

اف رے تصرفاتِ عشق آگ لگی دھواں نہ ہو
ڈوبے ہوئے ہیں سنگدل لذتِ سوز و ساز میں

ایک ایک لفظ پر روحِ سخنوری وجد میں آتی ہے۔ یہ وہ صوت سرمدی ہے جو دل میں عشق و محبت کی لہر دوڑا کر انسان کو حیات ابدی کرامت فرماتی ہو۔ کیا کوئی صحیح الدماغ شخص اس بات کا دعوی کر سکتا ہے کہ تصرفات عشق کی ایسی زندہ تصویر غالب کے قلم سے کھچ سکتی تھی۔ استغفراللہ۔ آگ لگے دھواں نہ ہو۔ سنگدل سے سنگدل بھی لذت سوز و ساز میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ یہ ہیں تصرفاتِ عشق اور ایسی الہامی زبان میں نمایاں کئے گئے ہیں جس پر غالب تو کیا میر کا دسترس مشکل سے ہو سکتا تھا۔ الٰہی تیری شان جس کا دل ایسے حقایق و معارف کا گنجینہ ہو جس کی زبان ایسے رموز و اسرار کی ترجمان ہو۔ وہ سرزمین ہند میں فاقہ کشی کرے اور دنیا کی نگاہوں میں اُس کی ہستی حرفِ غلط سمجھی جائے۔

ایں چہ بوالعجبی است۔

ہاں اے سخنور علی الاطلاق دیکھ اس مادی زندگی کی تلخیوں اور زمانہ مردہ پرست کی کج ادائیوں سے دلتنگ نہ ہونا اپنی بزرگی و عظمت میں شک نہ لانا تو اپنی واجب الاحترام شخصیت کا گہری نظر سے مطالعہ کر دیکھ آسمانی فرشتہ تجھے ہدایت کرتا ہے کہ تیری بزرگی و عظمت کی بنا تیرا زبردست احساس۔ تیرا وسیع و بلند تخییل۔ تیری دلکش و دل آویز موسیقی۔ تیرا ترانہ سرمدی ہے۔ عشق و آزادی تیری فطرت کے جوہر ہیں۔ عشق تجھے حیات حقیقی کا جلوہ دکھاتا ہے

اور آزادی کا تقاضا یہ ہے کہ تو اسے اپنے اصلی رنگ میں پیش کر دے۔ تو مناظر طبعی کے حُسن۔ انسانی حُسن اور حیات اجتماعی کے حُسن کی نقاشی کر اور اگر حُسنِ زندگی کسی صورت میں معدوم ہو جائے یا تاریکی کے پردہ میں چھپ جائے تو اپنے تخیل سے جو سراسر قوتِ خلق و اختراع ہے کام لے کر ایک نئے جہانِ حسن کی بنیاد ڈال۔ یہ سچ ہے کہ دیگر اشیا کی طرح تو بھی اپنے زمانے کی پیداوار ہے اور اس حیثیت سے تیرے تاثرات ان ایام کی صحیح تصویر اور حقیقی تاریخ کہے جانے کے مستحق ہیں مگر اپنے زمانے سے بلند ہو کر اور آگے بڑھ کر آئندہ کے لئے تو ایک نئی زندگی وجود میں نہیں لا سکتا یا کم از کم اُسی زندگی میں تازہ لہر نہیں دوڑا سکتا تو پھر تو اس قابل نہیں ہے کہ شاعر کے مقدس لفظ کا اطلاق تجھ پر کیا جا سکے۔ ہاں اپنی خلاقیت کو کام میں لا کر ایک نیا جہان پیدا کر اور زمانے کو اُسی کی طرف اپنی دلکش صوت سرمدی کی رَو میں بہائے چل۔ حریت فکر کا جامہ پہن۔ زنجیر تقلید سے آزاد ہو کر اپنی موسیقی میں بھی ایک آزاد انداز طبعی اختیار کر۔

اے پہلو نشینِ ٹگور اے بالا نشینِ غالب تو خود اپنے ساختہ و پرداختہ جہان معانی کی سیر کر اور دنیا کو دکھا دے تو کن پہلوؤں سے کن اعتبارات سے ان کا ہمسر ہے اور کن اعتبارات سے افضل ہے۔ اے دلدادہ خود شناسی تو اپنے ہمصفیران و ہمنوایان ماضی و حال کے ترانہ وجدانی کو بھی غور سے سن اور اعتراف کر۔ نہیں میں نے یہ کہا تجھ سے بڑھ کر ٹگور و غالب کا رتبہ شناس کون ہو سکتا ہے۔ ان سخنوران علی الاطلاق کا اعتراف صحیح تیرے سوا کون کر سکتا ہے۔ مگر ہاں یہ بزرگوار جن منازل تک پہنچے ہیں تو اُن سے آگے نکل جانے کا ارادہ باندھ لے۔ تیری

شاعری کا موضوع حسن و عشق۔ آزادی و حریت۔ تہذیب اخلاق و انسانیت جیسی وسیع چیزیں ہیں اور اس موضوع کے لئے ایک ایسا وسعت آبادِ موسیقی چاہیئے جو صحیح طور پر اس کی تگ و دو کی جولانگاہ بن سکے۔ اے حکیم فرزانہ فلسفہ و حکمت کے حقیقی عناصر بھی تیرے شعر کا جزو ہیں تیری فکر رسا عام سطح سے بلند ہو کر اپنے اصلی کاشانے کا سراغ لگائے تو تیری قلمرو کا ڈانڈا نبوت کی سرحد سے مل جائے۔ نہیں نہیں یہ صوت سرمدی جو تجھے آسمانی دربار سے عطا ہوئی ہے اگر اغراض و نفسانیت کی آلودگی سے پاک ہو کر حقیقت کو جلوہ آرا کرے۔ تو انسان کو خدائی طاقت دے سکتی ہے۔ دیکھ یہ بڑی نعمت ہے اسے ضائع نہ کیجیو۔ یہ سچ ہے کہ تو بھی بشر ہے جامۂ بشریت میں کشمکش حیات سے تجھے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے تیری مادی زندگی بھی کچھ نہ کچھ مطالبہ رکھتی ہے اور نامساعدت روزگار کے ہاتھوں تجھ کو بعض اوقات اپنے ہم نشینوں کا شرمندۂ احسان بھی ہونا پڑے گا کیونکہ دنیا عالم اسباب ہے اکثر اوقات تجھے نا اہلوں سے بھی واسطہ پڑے گا مگر حاشا کسی وقت ان کے بار احسان سے دلگیر و ملول نہ ہونا تیری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو ان کا احسان اُتر جائے۔ تو اپنے نغمہائے سرمدی سے زندگی کی ایسی لہر دوڑا دے کہ روح انسانیت و شرافت وجد میں آجائے اور تجھ پر احسان رکھنے والے اپنے ناچیز و بے حقیقت احسان کو بھول جائیں۔ دیکھ زمانہ زبردست انقلاب سے دوچار ہو رہا ہے۔ قومیں زیر و زبر ہو رہی ہیں۔ مادی جاہ و حشم آنکھوں کو خیرہ کئے دیتے ہیں۔ کثافت سفلی نے انسانیت کے لطیف جوہر پر پردے ڈال دیئے ہیں مادی زندگی کی پیکار زوروں پر ہے۔ دنیا اقتصادی فشار سے دبی جا رہی ہے

لوگ روٹی کے ٹکڑوں پر کتوں کی طرح لڑ رہے ہیں۔ انواع و اقسام کی غلامی نے عالم کو جکڑ لیا ہے کذب و افترا تملق و چاپلوسی کا بول بالا ہے غرض انسان پستیٔ اخلاق کی گہرائیوں میں غرق ہوا جا رہا ہے۔ تو ایسے نازک وقت میں اپنے انسانی شرف و ناموس کو بٹہ نہ لگانا۔ اپنے احساس کی صداقت کو ہاتھ سے نہ دینا۔ اپنی آزادی کی روح کو برقرار رکھنا شعریت و ادبیت جیسی مقدس نعمتوں کو آلودۂ شرمساری نہ کرنا۔ خدائے عز و جل۔ اُس کے فرشتے۔ آسمان اور اُس کے آفتاب و ماہتاب اور تمام سیارے ٹکٹکی باندھے تجھے دیکھ رہے ہیں اور نہایت شوق سے اس امر کے منتظر ہیں کہ تو اپنی آسمانی طاقت کو حقیقت کی ترجمانی کرنے میں کیونکر صرف کرتا ہے۔ تو ایک چشمہ شیریں ہے جو مبدا رحقیقت سے پھوٹ نکلا ہے ہاں وادی حیات میں دریائے راوی کی طرح موجیں مارتا چلا جا کوہستانوں۔ میدانوں۔ گلزاروں اور سبزہ زاروں سے زندگیِ عشق کے گیت گاتا۔ صداقت و حقیقت کا پیغام پہنچاتا گزر جا اور آخر کار حقیقت کے سمندر سے ہمکنار ہو جا۔ بندگان دنیا یعنی آلودہ مادیت اگر اپنی کوتاہ بینی کے باعث تجھے دیوانہ یا زندگی سے بیگانہ یا ننگ تہذیب و تمدن تصور کر کے حقارت کی نگاہوں سے دیکھیں تو ان سے اعراض کر اور پیغمبرانہ اولوالعزمیوں سے کام لے کر بارگاہ احدیت میں عرض کر خداوندا انہیں معاف کر دے کیوں کہ یہ نہیں جانتے۔

اُف رے تصرفات عشق ۔ اُف رے تصرفات عشق

یادِ خدا کا وقت بھی آئے گا کوئی یا نہیں
یادِ گناہ کب تلک شام و سحر نماز میں

سبحان ربی العظیم وبحمدہ۔ یہ ہے نماز کا سچا فلسفہ۔ مذہبی دیوانے جو نفسِ عبودیت سے بے خبر اور محض رسمیات مذہب کے پابند ہیں کاش اپنے ہیئے کی آنکھ کھول کر نماز کے اس فلسفہ پر غور کرتے۔ ذرا سوچو تو سہی جب نماز کی حالت میں بھی تمہیں اپنا اور اپنے گناہوں کا تصور بندھا ہوا ہے تو پھر یہ نماز کیا ہوئی۔ نماز تو محض یادِ خدا کا نام ہے اپنے گناہوں کا تصور جبتک بندھا ہوا ہے اُسوقت تک تم قیدِ خودی سے آزاد کیونکر ہو سکتے ہو۔ اپنی خودی کو ترک کر کے محض ایک ہستی مطلق کی طرف لَو لگاؤ۔ جب تمہاری نماز پر نماز کا اطلاق ہو سکتا ہے شعر پر غور کرو اور شاعر کے مطمح نظر کو سمجھو اس سے بڑھ کر شانِ عبودیت اور کیا ہو گی۔ نماز کے متعلق جس کے احساسات اتنے بلند اور اتنے صحیح ہوں اگر وہ رسمیات مذہب کی ظاہری پابندیوں میں کوتاہی بھی کرے تو کیا اُس کا انجام بخیر نہ ہو گا محض اس وجہ سے کہ وہ عملی طور پر رسمیات مذہب کی پابندی نہ کر سکا۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ دنیا ایسے شخص کی نسبت جو کچھ بھی رائے قائم کرے مگر ایزد جل شانہٗ کی بارگاہ میں اُس کے احساسات و معتقدات بھی کچھ وزن رکھتے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ معتقدات و احساسات بھی انسان کے اعمال میں شامل ہیں۔

انگلستان کا مشہور و معروف سخنور رابرٹ براؤننگ بھی اس حقیقت کی تہ کو پہنچ چکا ہے کہ انسان کے خیالات بھی اُس کے اعمال ہی میں داخل ہیں چنانچہ

اپنی ایک نظم ربی بن عزرا کے ایک بند میں یہ کہتا ہے:۔

"دنیا والے اُن خیالات سے بالکل بے خبر رہتے ہیں جو انسان کے دل میں پوشیدہ رہتے ہیں خواہ ان میں کتنے ہی اعلیٰ مقاصد۔ پاکیزہ منصوبے اور نادر تخیلات ہی کیوں نہ ہوں۔ چونکہ وہ عمل کی شکل میں ظاہر نہیں ہوتے اُس وجہ سے دنیا میں اُن کی کوئی قدر و قیمت نہیں لیکن حقیقت میں وہ بھی انسان کے اعمال میں شامل ہیں"۔ مرزا صاحب کا یہ فلسفہ نماز (جو محض اُنہیں کے احساسات کا نتیجہ ہے) بھی کیا عجب ہے کہ بارگاہ احدیت میں مقبول ہو کر اُن کے اعمال میں لکھا جائے۔ کیونکہ اب تک نماز کا ایسا اعلیٰ مقصد اور کسی نے پیش نہیں کیا۔

سجدہ اوّلین میں پاس پا گئے دادِ بندگی
شادی مرگ ہو گئے عید کے دن نماز میں

ذرا اُس بندۂ خوش نصیب پر غور کرو جو بس عید بقرعید۔ کی نماز پڑھ لیتا ہو زہے نصیب اُس کے کہ پہلے ہی سجدہ میں دادِ بندگی پا گیا پہلا ہی سجدہ قبول ہو گیا۔ اس سے بڑھ کر خوشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ایسا خوش نصیب شادی مرگ نہ ہو جائے تو کیا ہو۔ سبحان اللہ کیا کیفیت وجدانی ہے غور کرو تو روح بیدار ہو جائے۔ ٹگور اور غالب کے بہتیرے ماسٹر پیس پڑھے ہوں گے مرزا صاحب کے ماسٹر پیس بھی تمہارے سامنے ہیں۔ ہاں یہ بھی بتا دینا ضرور ہے کہ بعض لوگ اس شعر میں شادی مرگ کو باضافت پڑھتے ہیں حالانکہ یہاں اضافت مقلوب ہے شادیِ مرگ پڑھنا غلط ہے۔ یہاں مصنف نے ایک عروضی نکتہ رکھا ہے جو لوگ عروض

سے واقف نہیں اُنہیں یہ مصرع ناموزون معلوم ہوگا۔

حُسنِ فطرت بولتا ہے پردۂ اسرار میں
معنیِ بے لفظ پنہاں ہیں زبانِ خار میں

اے نیند کے ماتوں کو بیداری کا پیغام پہنچانے والے اے سخنورِ معجز بیان قدرت نے تیری زبان میں کیا تاثیر ودیعت کی ہے کہ جو لفظ منہ سے نکلتا ہے وہ نغمہ جان نواز کا حکم رکھتا ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی حُسنِ فطرت کا بولنا اور پردۂ اسرار میں بولنا اور زبانِ خار سے معنیِ بے لفظ کا پیدا ہونا ان میں سے کون سی بات ہے جو جلوۂ حقیقت سے معمور نہیں۔ آخر ان الفاظ میں کون سا اعجاز بھرا ہے کہ انسان سُن کر عالمِ وجدانی میں پہنچ جاتا ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا یہ شعر

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

عالمِ بالا میں ایسا مقبول ہوا کہ فرشتوں کا وظیفہ بن گیا۔ مگر گستاخی معاف مرزا صاحب کا یہ شعر سُن کر جو نشہ معرفت چھا جاتا ہے اور صناعت شاعرانہ کے اعتبار سے یہ شعر جس حدِ کمال کو پہنچا ہوا ہے کیا شیخ علیہ الرحمۃ کا شعر بھی فی الحقیقت اُسی مرتبہ پر فائز ہے؟ انصاف سے دیکھو گے تو اس سوال کا جواب نفی کے سوا اثبات میں نہ دے سکو گے۔ اگر عالمِ بالا سے بھی اس شعر کی داد نہ ملی تو یہی کہنے پڑیگا کہ سخن فہمی عالمِ بالا معلوم شد۔

ذوق جبتک ہے جبھی تک ہے بہار رنگ و بو
دل ہے جبتک دل جبھی تک ہے کھٹک بھی خار میں

واہ کیا حکیمانہ احساسات ہیں۔ دنیا کی دلچسپیاں زندگی کی تمام کیفیات رنج وراحت محض اپنے احساسات کے دم سے وابستہ ہیں۔ دل ہی مردہ ہو گیا تو پھر نہ پھولوں کی مہک کوئی کیفیت رکھتی ہے نہ کانٹوں کی کھٹک۔

نشۂ یکرنگ میں دونوں ہیں کیا ڈوبے ہوئے
کیسی جنگ زرگری ہے کافر و دیندار میں

شاعر کا ذوق نظر کتنا حیرت انگیز ہے۔ کافر و دیندار کی جنگ ایک ایسا مشاہدہ ہے جو فلسفی کے پیش نظر بھی ہوتا ہے اور شاعر کے بھی۔ مگر قدرت نے شاعر کو کچھ اور ہی نگاہ عطا فرمائی وہ اسی مشاہدہ کو اتحاد و وابستگی کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا اور دکھاتا ہے کہ کافر و دیندار کی جنگ فی الحقیقت کوئی جنگ نہیں ہے بلکہ دونوں پر نشۂ یکرنگ چڑھا ہوا ہے اور اسی یکرنگی کے نشہ میں وہ جنگ زرگری کر رہے ہیں۔ بادی النظر میں جو جنگ معلوم ہوتی ہے وہ محض ایک نمائشی تماشا ہے۔ سبحان اللہ کیا ذوق نظر کیا حیرت انگیز طرز استدلال ہے۔ شاعر کی فطرت میں یہ خداداد ملکہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی حقیقت کو جو اور اور طرح سے ثابت ہو چکی ہے بالکل اچھوتے انداز سے ثابت کر کے نئی دنیا کی سیر کراتا ہے۔

غفلت امروز میں اندیشۂ فردا ہو گم
نشہ اتنا ہو کم از کم وعدہ دیدار میں

خواب شیریں کی ہوس کیا خواب بد کا خوف کیا
آ چکی اب نیند اپنے دیدہ بیدار میں

ناخدا کچھ زورِ طوفاں آزمائی بھی دکھا
فکر ساحل چھوڑ لنگر ڈال دے منجدھار میں

بیڑا تلاطم میں پڑا ہے ایسے نازک وقت میں ناخدا سے خطاب کرتا ہے کہ فکر ساحل سے باز آ اور منجدھار میں لنگر ڈال کر طوفان آزمائی کا زور دکھا یا و مخالف سے زور آزمائی کر واہ کیا اولوالعزمی کیا ہمتِ و استقلال ہے۔

عمر گھٹنے کے لئے ہے وقت کٹنے کے لئے
مفت دن گننے کو ہم پکڑے گئے بیگار میں

زیست رائگان کا یہ فلسفہ اتنے درد انگیز پیرایہ میں میر و غالب تو کیا نظیری و عرفی نے بھی شاید ہی بیان کیا ہو۔ ایک بات قابل غور یہ بھی ہے کہ بیگار کے ایسے بھونڈے قافیہ میں اتنا عبرت انگیز فلسفہ بیان کر جانا اور اس خوبی کے ساتھ کہ بد مذاقی کی بو تک نہ آنے پائے کمال صحیح المذاقی کا بین ثبوت ہے۔ یہ وہ مشکل مقام ہے جہاں بعض اہل زبان بھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں کلام میں ابتذال

پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں مصنف نے وہ کمال دکھایا ہے کہ شعر سنتے ہی سناٹا سا دوڑ جاتا ہے۔ شعر کی خوبی کا بہترین معیار یہ ہے کہ زبان زد ہو جائے۔

یاس گمراہی سے اچھی زحمت واماندگی
ڈال لو زنجیر کوئی پائے کجرفتار میں

شاہد نادیدہ را آثار نتوان یافتن
دسترس بر پردۂ اسرار نتوان یافتن
بہرۂ از فکر دور از کار نتوان یافتن
داد سعی از پائے کجرفتار نتوان یافتن
حشر بے ہنگام خواہی از طلسم خود برآ
ورنہ ہیچ از وعدہ دیدار نتوان یافتن

کار فردا بر خود آسان کن کہ بعد از خواب مرگ
اندکے از فرصت بسیار نتوان یافتن
اے دل بیدار ما اے ننگ غفلت الوداع
ہیچ ازیں ہنگامہ بازار نتوان یافتن

چارۂ ہر دردِ سر از دردِ دل فرمودہ اند
وائے بر دردے کہ در بازار نتوان یافتن

اہل دل کا یہ ارشاد تو بجا ہے کہ ہر دردِ سر کا واحد علاج دردِ دل ہے مگر دردِ دل حاصل ہو تو کیونکر بازار میں ڈھونڈھے سے ملتا نہیں۔

ہر دلِ آسودہ ہست آمادۂ صد انقلاب
از دلِ بے ماجرا آثار نتوان یافتن

ہر وہ دل جسے تم بظاہر آسودہ پاتے ہو غور سے دیکھو تو اُسے سیکڑوں انقلاب کے اندیشہ میں مبتلا پاؤ گے۔ دنیا میں کوئی ایسا دل نہیں جو بے ماجرا کہا جا سکے جس پر کوئی واردات نہ گزری ہو۔

ہر گل و بلبل چہ گوید از فریبِ رنگ و بو
ہر کسے را ہمزبانِ خار نتوان یافتن

گل و بلبل کو فریب رنگ و بو کی کیا خبر۔ اس طلسم کی حقیقت کچھ بیان ہو سکتی ہے تو زبان خار سے۔ مگر ہر کوئی خار کا ہمزبان نہیں ہوتا مآل کار کی خبر خار کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا۔

ہوشیار اے ساکنِ دار الامانِ خار و خس
زینہار از برقِ بے زنہار نتوان یافتن

زینہار بمعنی پناہ۔ برق بے زنہار یعنی برق بے پناہ۔ کہتا ہے کہ اے باغِ عالم

میں بسیرا لینے والو تم نے اپنے آشیانے کو جو محض خار و خس کا مجموعہ ہے دار الامان سمجھ رکھا ہے۔ نہ جانے تم کس غلط فہمی میں پڑے ہو۔ ہوشیار رہو کہ اس بے حقیقت دار الامان کو برق بے پناہ سے پناہ نہیں ملنے کی۔ انصاف سے دیکھو کیا غالب کا دیوان اس الہامی تخیل کا جواب پیش کر سکتا ہے۔ آشیانے کو دار الامان خار و خس سے تعبیر کرنا کیا غالب سے ممکن تھا۔

گفتنی ناگفتنی باشد دریں غفلت سرا
گوش محرم از در و دیوار نتوان یافتن

اس غفلت سرائے دہر میں گفتنی بھی ناگفتنی ہے۔ کوئی اپنا درد دل کہے تو کس سے دنیا کی دنیا خواب غفلت میں پڑی ہے۔ در و دیوار سے گوش محرم تو پیدا نہیں ہو سکتے۔

مے تواند یافت از بزم یگانہ ہر دلے
آنچہ از بیگانہ اسرار نتوان یافتن

کیا چل سکے گی باد مخالف مزار میں
جلتا ہی دل جلوں کا چراغ اس دیار میں

مطلع کیا ہے مطلع الانوار ہے۔ زندگی میں باد مخالف نے دل جلوں کا چراغ جلنے نہ دیا نہ سہی۔ مگر دیار لحد میں دل جلوں کا نصیبہ چمک گیا۔ یہاں باد مخالف کا گزر نہیں

ہو سکتا سوز و گداز کے ساتھ کلام کا بانکپن دیکھنے کے قابل ہے یہ ہے خواجہ آتش کا رنگ۔

اُلٹی ہوا زمانے میں چلتی ہے آج کل
فرق آگیا ہے گردش لیل و نہار میں
ہنستے ہیں اپنے حال پہ دیوانے آپ کے
رہتے ہیں مست پیرہن تار تار میں
یوسف کو لے اُڑے نہ کہیں بوئے پیرہن
اخفائے حسن و عشق نہیں اختیار میں
دیندار و بت پرست اُترتے ہیں ایک گھاٹ
کیا معجزہ ہے جنبشِ ابروئے یار میں
منزل کی دھن میں آبلہ پا چل کھڑے ہوئے
شور جرس سے دل نہ رہا اختیار میں
ہنستا ہے ناخدا مرے انجام کار پر
کشتی عمر جب نہ رہی اختیار میں
کس کل پہ ہے یہ خاک کا پتلا بنا ہوا
کیا جانیں کیا طلسم ہے مشت غبار میں

لیلی کجا۔ کجا یہ طلسمات عنصری
کیا ڈھونڈھتا ہے پردۂ گرد و غبار میں

کاش کوئی اتنا ہوتا کہ ان اشعار کے معانی و مطالب ٹگور کو سمجھا سکتا۔ مضامین عالیہ کا دریا امنڈتا آرہا ہے۔

ہو نہ خاک ہونے کا اللہ رے اشتیاق
اترے ہم اپنے پاؤں سے اپنے مزار میں
شرمندۂ کفن نہ ہوئے آسمان سے ہم
مارے پڑے ہیں سایۂ دیوار یار میں

خوشا انجام عشق کہ سایہ دیوار یار میں مارے پڑے ہیں۔ عاشق کے لئے سایہ دیوار یار سے زیادہ مبارک کفن اور کیا ہو سکتا ہے۔ آسمان نے کفن سے محروم رکھا چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ مارے پڑے ہیں کی لطافت معنوی پر اردوئے معلی جتنا ناز کرے بجا ہے۔

کہتے ہو اپنے فعل کا مختار ہے بشر
اپنی تو موت تک نہ ہوئی اختیار میں

جبر و قدر کے الجھے ہوئے فلسفہ کو آج تک کوئی سلجھا نہ سکا۔ مگر شاعر کی زبان آوری کے صدقے دو لفظوں میں اس پیچیدہ مسئلہ کو برچھا دیا۔ اپنی تو موت تک نہ ہوئی اختیار میں۔ اس دو حرفی لفظ "تک" نے اس مسئلہ کو حل کر دینے

میں جو مار دی ہے اُس کی قدر و قیمت کا اندازہ اہل نظر پر موقوف ہے۔

دنیا سے یاس جانے کو جی چاہتا نہیں
واللہ کیا کشش ہے اس اجڑے دیار میں

کون سا دل ہے جو یہ شعر سُن کر دیوانہ نہ ہو جائے۔ یہ وہ شعر ہے جس پر اہل دل کے گریبان اور غالب کے ایسے سیکڑوں دیوان پھٹتے ہیں۔

مجذوب کی بَڑ

ہارنے والے کبھی کافرو دیندار نہیں ۔۔۔ کشتیاں لڑتے ہیں اب ہاتھ میں تلوار نہیں
فاقہ مستی میں یہ ہُو حق کہ الٰہی توبہ ۔۔۔ نشہ ایسا کہ اُترنے کے کچھ آثار نہیں
سب اسیران قفس گاتے ہیں صیاد کا گُن ۔۔۔ کون اس بھول بھلیاں میں گرفتار نہیں
کشتی دل ہے کہ بازیچۂ طوفانِ ہوس ۔۔۔ دور تک ساحل امید کے آثار نہیں
لائیگی غفلتِ امروز قیامت کی خبر ۔۔۔ بخت بیدار کجا فتنہ بھی بیدار نہیں
اپنا گھر اپنی زمین اپنا فلک بیگانہ ۔۔۔ آشنا کوئی بجز سایہ دیوار نہیں
وقت کی بات ہے وقت آئی تو سب آسان ہے ۔۔۔ سہل تو سہل ہی دشوار بھی دشوار نہیں
بد دعا کرتا ہوں ناحق کبھی کرتا ہوں دُعا ۔۔۔ یاس کیا کیجے جب ہاتھ میں تلوار نہیں

"بک گیا ہوں جنون میں کیا کیا کچھ"
"کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی"

دستِ شل کو دخل ناممکن خطِ تقدیر میں
جائے نقطہ بھی نہیں باقی کسی تحریر میں

دیکھئے انجام کیا ہو ہستیِ موہوم کا
پڑ گیا ہے اختلاف اس خواب کی تعبیر میں

خودکشی بھی بن نہ آئی پھر دوا پینا پڑی
ہائے یہ تلخی کہاں تھی زہرِ بے تاثیر میں

کافر و دیندار میں ہے رشتہ واحد وہی
سب کے سب جکڑے ہوئے ہیں ایک ہی زنجیر میں

آئینہ دکھلا رہا ہے صورتِ آبادِ جہان
حسنِ معنی جلوہ گر ہے پردۂ تصویر میں
شوخیاں کیا کیا دکھائیں حسنِ مشتِ خاک میں
عالمِ جان سے نکل کر عالمِ تصویر میں

خاک کا پتلا بھی یوں باتیں بناتا کیا مجال
راز ہے پنہاں کوئی اس بولتی تصویر میں

(اصل و نقل کا فرق)

اصل کے آگے فریب نقل چل سکتا نہیں
بوئے مستانہ کہاں پیراہنِ تصویر میں

⁂

(انقلاب دہر)

دیکھتے ہی دیکھتے بدلا زمانے کا یہ رنگ
پھولوں میں خوشبو حسینوں میں وفاداری نہیں
چھوڑ کر جائیں کہاں اب اپنے ویرانے کو ہم
کونسی جا ہے جہاں حکمِ خزاں جاری نہیں

(عشق کی چنگاری بجھتی نہیں)

صبر کہتا ہے کہ رفتہ رفتہ مٹ جائیگا داغ
دل یہ کہتا ہے کہ بجھنے کی یہ چنگاری نہیں
جلوہ گر رہنے لگا چشم تصور میں کوئی
حضرتِ دل بے سبب راتوں کی بیداری نہیں

(شب ہجر کی مصیبت)

جھیل لیں گے ہجر کے مارے قیامت کا بھی دن
آج کی شب تو کٹے پھر کوئی دشواری نہیں

(دور اندیشی)

نتیجہ کچھ بھی ہو لیکن ہم اپنا کام کرتے ہیں
سویرے ہی سے دور اندیش فکرِ شام کرتے ہیں

(ضرور ٹھوکریں کھائیں گے)

چلیں کیوں دوڑ کر نادان جو ایسی ٹھوکریں کھائیں
بلند و پستِ عالم کو عبث بدنام کرتے ہیں

⁂

جہنم میں بھی جلنے کے لئے حاضر ہیں پروانے
کہیں اہل ہوس اندیشۂ انجام کرتے ہیں

تمہارے واسطے کعبہ تو کیا ہے دل بھی حاضر ہے
مسلمان بھی کہیں پروائے ننگ و نام کرتے ہیں

یہ کس کے سر رہے گا خون ناحق بے گناہوں کا
وفاداروں کی ضد سے آپ قتل عام کرتے ہیں

بجھائے کون اب دل کی لگی شوق شہادت میں
ہم اپنے ہاتھ سے لبریز اپنا جام کرتے ہیں

ہزاروں مر کے زندہ ہو چلے کوئے تمنا میں
ہم ایسے سخت جان اس خاک کو بدنام کرتے ہیں

دل ویراں نہیں اک محشرستان تخیل ہے
اسی زنداں سے ہم سیر ہجوم عام کرتے ہیں

دل وحشی بغیر اُن کے نہ بہلا ہے نہ بہلے گا
یہ کس دیوانے کی خدمت وہ میرے نام کرتے ہیں

نہیں دیکھا ہے لیکن غائبانہ لاگ ہے دل کو
جبھی تو لوگ تیرا ذکر صبح و شام کرتے ہیں

مبارک ہو مصوّر کو تری تصویر کا سودا
کہیں اہل نظر ایسا خیال خام کرتے ہیں

نگاہوں سے گرایا یاس کو کمبخت اسی دل نے
اسی دل کی بدولت لوگ کیا کیا کام کرتے ہیں

(فلسفۂ دُعا)

رسمِ دنیا نہ سہی فرض ادا کرتے ہیں
ہاتھ اُٹھے یا نہ اُٹھے دل سے دُعا کرتے ہیں

(ظالم مظلوم نما)

حضرتِ دل ہیں عجب ظالم مظلوم نما
گھر جلا کر کفِ افسوس ملا کرتے ہیں

(دلِ دیوانہ نما)

دیکھنا یہ ہے کہ سر گشتۂ سعیِ باطل
کیا علاجِ دلِ دیوانہ نما کرتے ہیں

اگر سچ مچ کوئی دیوانہ ہو تو کچھ علاج بھی کیا جائے مگر جو جھوٹ موٹ کسی مصلحت سے دیوانہ بن گیا ہو تو اُس کی چارہ سازی کیا ہو۔ ایسوں کی چارہ سازی باطل نہ ہوگی تو اور کیا ہوگی؟

(بیداریٔ موہوم)

عمر بیداریٔ موہوم کے دھوکے میں کٹی
اب جو چونکے ہیں تو آپ اپنا گلہ کرتے ہیں

ہم جسے بیداری سمجھتے تھے افسوس ہے کہ وہ بیداری نہ تھی۔ بیداری موہوم تھی۔ اب چونکے تو آپ اپنی غفلتوں کا شکوہ کرتے ہیں۔

(مژدہ فردا کی محویت)

لذتِ مژدۂ فردا میں جو ہیں ڈوبے ہوئے
طعنۂ غفلتِ امروز سنا کرتے ہیں

جن کی نظر آج سے زیادہ کل پر ہے جو اپنے انجام پر نظر رکھتے ہیں وہ امید افزا مستقبل کے مزے میں ایسے ڈوبے ہوئے ہیں کہ آج کی خبر ہی نہیں رکھتے۔ موجودہ زندگی جوں توں گزار دیتے ہیں۔ لوگ اُن کی بے پروائی پر طعنے مارتے ہیں وہ چپ چاپ سُنتے ہیں۔

پاؤں ٹوٹے ہیں مگر آنکھ ہے منزل کیطرف
کان ابتک ہوسِ بانگِ درا کرتی ہیں

شکستہ پائی کی حالت میں آنکھ منزل کی طرف اور کان آواز جرس کی جانب لگے ہوئے ہیں دامن امید ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔

(مستقبل روشن)
دیکھ کر دور سے مستقبلِ روشن کی جھلک
جان نظارۂ اوّل پہ فدا کرتے ہیں

فلسفہ امید پر کتنے پر جوش الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔ مستقبلِ روشن کی ذرا سی جھلک دیکھ کر مست و سرشار ہو گئے۔

بے اجل منزلِ فانوس پہ مرنے والے
جان کیا دیتے ہیں اک رسم ادا کرتے ہیں

موت تو اُن کی قابل رشک ہے جو شاہد مقصود سے ہم آغوش ہو کر دل کی لگی بجھا لیتے ہیں اُن کا مرنا کیا جو اپنی منزل مقصود سے دور سر ٹپک ٹپک کر بے موت مرتے ہیں۔ ایسی موت کس کام کی جو محض ایک رسم کی طرح ادا کر دیجائے۔

(دوسری غزل ترک دعا)
موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

خدا کی پناہ - نہ جانے کس دُکھے ہوئے دل سے کہا ہے۔ ارے میں نے خدائی تو نہیں مانگی تھی فقط موت مانگی تھی وہ بھی نہ ملی پھر تجھ سے کوئی کیا مانگے۔ دوسرے مصرع سے کیا لاڈلا پن ٹپکتا ہے کہ لے دعا کر چکے اب آیندہ کوئی دعا نہ کریں گے۔

کچھ نہ مانگیں گے۔ کیا ملا عرضِ مدعا کر کے بات بھی کھوئی التجا کر کے۔ شعر کو غور سے پڑھو اور شاعر کے درد دل کا اندازہ کرو۔ آج غالب زندہ نہیں ورنہ سناٹے میں آجاتے۔

ناخدا تیرے ارادوں میں خدا برکت دے
یاس اک مرتبہ پھر قصد دعا کرتے ہیں

(اعترافِ جرم)

بندۂ فطرت مجبور ہوں مختار نہیں
ہاں ندامت میں ہے شک جرم سے انکار نہیں

میں بندۂ فطرت اور فطرت خود اپنے مقررہ دستور وقانون سے مجبور۔ گویا مجبوروں کا مجبور ہوں۔ پھر اپنے جرم وخطا پر ندامت کے کیا معنی؟ پاس ادب جرم سے انکار کرنے کی اجازت نہیں دیتا مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اپنی ندامت میں مجھے شک ہے۔

(گردشِ قسمت کی ناہمواری)

روشِ خامہ قسمت کبھی ہموار نہیں
گردش بخت سیہ گردش پرکار نہیں

پرکار کی گردش تو ہموار ہوتی ہے مگر خامہ قسمت کی روش ایسی ٹیڑھی بکڑی ہے جس کا کچھ ٹھیک نہیں۔

(جلوۂ بے فیض کی دھوم)

شش جہت میں ہے ترے جلوۂ بے فیض کی دھوم
کان مجرم ہیں مگر آنکھ گنہگار نہیں

اے زہر بخت کہ سر تیری امانت کے سوا
نشہ دولت دنیا سے گرانبار نہیں

جا دو کو کاروان عدم کی خبر نہیں
ایسے گئے کہ نقش قدم کا اثر نہیں
سنتا ہوں آپ خانہ دل میں ہیں جلوہ گر
دیوار درمیان ہے مگر کچھ خبر نہیں
کعبہ نیا بناؤ مرے دل کو توڑ کر
اے مہربان اب آپکے قابل یہ گھر نہیں
آجائے تیرا نام زبان پر تو کیا عجب
اب اپنے اختیار میں دردِ جگر نہیں
کعبہ نہیں کہ ساری خدائی کو دخل ہو
دل میں سوائے یار کسی کا گزر نہیں

غنیمت جان اُس کوچہ میں تھک کر بیٹھ جانے کو
کسے دم بھر ملا آرام دورِ آسمانی میں
تڑپ جاتے ہیں حُسن و عشق کا جب نام آتا ہے
اسی سے بس سمجھ لو یاس کیا ہونگی جوانی میں؟

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

سودا کے مشہور و معروف مطلع کے بعد میرزا یاس کے اس مطلع کو جو حسن قبول عطا ہوا ہے شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔ سودا کہتا ہے ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں ۔ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

(دولت صبر)
صدمے دئیے تو صبر کی دولت بھی دیگا وہ
کس چیز کی کمی ہے سخی کے خزانے میں

(غربت کی موت)
غربت کی موت بھی سبب ذکر خیر ہے
گر ہم نہیں تو نام رہے گا زمانے میں

دیواریں پھاند پھاند کے دیوانے چل بسے
خاک اُڑ رہی ہے چار طرف قید خانے میں

(دلبستگی قفس)
صیاد اس اسیری پہ سو جان سے ہیں فدا
دل بستگی قفس کی کہاں آشیانے میں

افسردہ خاطروں کی خزاں کیا بہار کیا
کنج قفس ہیں ہر رہے یا آشیانے میں

ہم ایسے بد نصیب کہ ابتک نہ مر گئے
آنکھوں کے آگے آگ لگی آشیانے میں

رہ رہ کے جیسے کان میں کہتا ہی یہ کوئی
ہونگے قفس میں کل جو ہیں آج آشیانے میں

لکھنؤ کی سرزمین سے ایسی پُر درد صدائیں بلند ہونا سراسر حیرت ہے۔ اگرچہ مرزا صاحب کی نشو و نما لکھنؤ میں ہوئی مگر اُن کا پتلا خاک عظیم آباد کا ہے اور یہی سبب ہے اس سوز و گداز کا ورنہ پہلے لکھنؤ میں کنگھی چوٹی کے سوا کیا رکھا تھا۔ اور اب بھی مرزا صاحب کو چھوڑ کر دیگر حضرات لکھنؤ کو دیکھو تو سوا جنازہ بازی اور سوگ نشینی کے کلام میں سچے درد کا اثر نہ پاؤ گے۔

خدا معلوم کیا سحر تھا اُس بت کی چتوں میں
چلی جاتی ہیں ابتک چشمکیں شیخ و برہمن میں

کنکھیوں سے جو ہم کو بزم میں تم دیکھ لیتے ہو
کھٹک جاتے ہیں کانٹے کی طرح ہم چشم دشمن میں

گلا گھٹنے لگا اب تنگ آیا ہوں گریبان سے
جنون نے واہ کیا پھانسی لگائی میری گردن میں

بہت دست جنون نے گدگدایا جب تو کیا کرتے
اتاریں بیڑیاں اور پہنے دُہرے طوق گردن میں
کسے معلوم داغ آتشیں سے دل پہ کیا گزری
سدھارے ٹھنڈے ٹھنڈے سونپ کر سب ہمکو مدفن میں
حجاب ناز بیجا پاس جس دن بیچ میں آیا
اُسی دن سے لڑائی ٹھن گئی شیخ و برہمن میں

فخریہ

کون ہوں کیا ہوں مجھے بھی دیکھ لیں اہل نظر
کوچہ گردِ لکھنو خاک عظیم آباد ہوں
مرد جاہل ہوں مگر جہل مرکب سے بری
شخص خود بین ہوں نہ میں خود ساختہ اُستاد ہوں
ہوں ادب پروردۂ بیتاب۔ فخر روزگار
نازاس پر ہے کہ خاک آستان شادؔ ہوں
شیرو رنجورؔ و تمنّاؔ و مبارکؔ کا غلام
خادم امدادؔ ہوں میں بندۂ آزادؔ ہوں
میرے محسن ہیں نہالؔ و شایقؔ و شیداؔ اور رازؔ
یاد ہیں مجھ کو تو سب میں بھی کسی کو یاد ہوں

جان سے بڑھکر سمجھتے ہیں مجھے یاسؔ اہل دل
آبروے لکھنؤ. خاک عظیم آباد ہوں
لکھنؤ کے فیض سے ہیں دو دو سہرے میرے سر
اک تو استاد یگانہ دوسرے داماد ہوں

(۱) مولوی سید علی خاں صاحب بیتابؔ عظیم آبادی جن کے فیض سے مرزا صاحب کی دماغی نشو و نما کی ابتدا ہوئی (۲) خان بہادر مولانا شادؔ مرزا صاحب کے معلم ثانی (۳) مولوی سید مرتضیٰ صاحب شیرؔ عظیم آبادی (۴) خاں بہادر شمس العلما مولانا سید محمد یوسف صاحب جعفری رنجورؔ عظیم آبادی (۵) مولانا سید محی الدین صاحب تمناؔ پھلواروی عظیم آبادی (۶) ڈاکٹر سید مبارک حسین صاحب مبارکؔ عظیم آبادی تلمیذ حضرت داغؔ دہلوی (۷) سید عنایت حسین صاحب امدادؔ عظیم آبادی (۸) حافظ فضل حق صاحب آزادؔ عظیم آبادی (۹) نواب سید صادق حسین خاں صاحب نہالؔ عظیم آبادی (۱۰) سید نذیر حسین صاحب شائقؔ عظیم آبادی (۱۱) سید علی حیدر صاحب شیداؔ عظیم آبادی (۱۲) سید عزیز الدین صاحب رازؔ بلخی عظیم آبادی۔

یہ قطعہ فخریہ سنہ ۱۹۲۰ء کی تصنیف ہے جس میں بزرگان و یاران عظیم آباد کو احترام و محبت سے یاد کیا ہے۔ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء میں ایک مشاعرہ درگاہ شاہ ارزان عظیم آباد میں ہوا تھا جس میں مرزا صاحب اور حضرت فصاحتؔ لکھنوی بھی تشریف لے گئے تھے۔ اُسی مشاعرہ میں مرزا صاحب نے یہ قطعہ پڑھا تھا مشاعرہ سے واپس آکر مرزا صاحب نے یہ قطعہ روزنامہ ہمدم میں شائع کر دیا تو اس مصرع پر (آبروے لکھنؤ خاک عظیم آباد ہوں) اہل لکھنؤ نہایت چراغ پا ہوئے۔

چونکہ اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا حقیقت تھی (مگر حقیقت تلخ) جسے غلط ثابت کرنا ممکن نہ تھا اور جوش حسد سے بھی مجبور تھے۔ تو بس جھنجھلا کر مرزا صاحب کی ہجویں لکھ ڈالیں۔ مرزا صاحب نے جب یہ دیکھا کہ یہ معمولی تفاخر بھی (جس میں حقیقت سے سرمو تجاوز نہیں کیا گیا تھا) یاران لکھنو پر گراں گزرا تو ایک اور دل لگی سوجھی 'داماد' کا قافیہ یاد آتے ہی ایک ایسا شعر قلم سے نکل گیا کہ مخالفین کو بغلیں جھانکنے کے سوا چارہ نہ تھا۔

یاسؔ کے ساتھ یگانہ تخلص کرنے کی بنیاد غالباً یہیں سے پڑتی ہے۔ اب مرزا صاحب کے نام کے ساتھ یگانہ لکھنوی دیکھ کر اور چڑ کا ہوا کہ اب تو یاس صاحب لکھنو اور لکھنویت دونوں پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر مرزا صاحب کا مطمح نظر ہرگز یہ نہیں ہوسکتا کہ عرف عام میں جسے 'لکھنویت' کہتے ہیں اُس سے اپنے تئیں آلودہ کریں۔

ملک کے اہل الرائے اب اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ صحیح معنی میں لکھنوی کا اطلاق کن شخصیتوں پر ہوسکتا ہے۔ رسالہ ہزار داستان لاہور میں اک اہل الرائے نے لکھنویت کے پرانے معیار کی ایسی قلعی کھولی ہے جسے دیکھ کر لکھنویوں کو سربگریبان ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ نامہ نگار مذکور لکھتا ہے:

"عوام الناس کا ذکر کیا لکھنو کے طبقہ خواص میں بھی یہ خیال خام وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے کہ لکھنوی وہی لوگ ہیں جو گومتی کے اِس پار پیدا ہوتے چلتے پھرتے کھاتے پیتے گڑتے مرتے ہیں۔ واہ کیا معیار لکھنویت ہے۔

غالباً ہر شخص کو اتنا تجربہ ضرور ہے کہ دنیا میں بہتیری باتیں جس قدر مشہور

اور مسلم ہوتی ہیں اُسی قدر غلط اور بے معنی ہوتی ہیں۔ انہیں باتوں میں اہل لکھنو کا مذکورۂ بالا خیال ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر وہ شخص جو خاص لکھنو میں پیدا ہوا گو اُسے لکھنو کے ساتھ بہ حیثیتِ مولد ضرور نسبت ہے لیکن لفظ لکھنوی کا اطلاق اُن بلند معنی میں جو اُس کے ساتھ مخصوص ہو گئے ہیں اُس پر ہونا لازمی نہیں ہے۔ اگر لکھنویت کا یہی معیار تسلیم کر لیا جاتا تو دھوبی۔ کہار۔ بھنگی۔ چمار سب کے سب لکھنوی بن جاتے مگر ایسا تو نہیں ہے۔ صحیح معنی میں لکھنوی کہے جانے کے مستحق وہی لوگ ہیں جن کی ذات لکھنو کے لئے خاص امتیاز و شرف کا باعث ہو نہ وہ لوگ جو لکھنو کو اپنی ذات کے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ جن لوگوں نے لکھنو کے تمدن و تہذیب میں نمایاں حصہ لیا اور اپنے فضل و ہنر کی روشنی پھیلائی۔ جن لوگوں نے لکھنو کے علم ادب۔ لکھنو کی زبان اور لکھنو کی شاعری میں پاکیزہ روح پھونکی بگڑے ہوئے مذاق کی اصلاح کی اور اپنے کمال ہنرمندی سے لکھنو کو لکھنو بنا دیا صحیح طور پر وہی لکھنوی کہے جانے کے مستحق ہیں۔ مگر ایسے لوگ کون تھے اور کہاں کے تھے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ہرگز لکھنو کے نہ تھے لکھنو کا ہر غیر ذمہ دار شخص اپنے منہ سے لکھنوی بننے کو بن جائے مگر حقیقت شناس نگاہوں میں ایسے غیر ذمہ دار اشخاص کبھی لکھنو سے منسوب نہیں کئے جا سکتے۔

لکھنوی ذہنیت کی یہ بوالعجبی کتنی مضحکہ انگیز ہے کہ چوک۔ نخاس۔ منصور نگر۔ شاہ گنج۔ مفتی گنج۔ نواز گنج اور چند مخصوص محلوں کے سوا جس قدر دنیا بستی ہے۔ وہاں کے باشندے سب کے سب گنوار ہیں۔ مگر اس خیال کو پیش نظر رکھ کر یہ معما سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر حضرات لکھنو میر انیس۔ خواجہ آتش۔ شیخ ناسخ۔

استاد بجر۔ خواجہ وزیر۔ میر وزیر علی صبا۔ نواب سید محمد خاں رند وغیرہ ہم پر کیوں فخر کرتے ہیں۔ ان بزرگواروں کو اگر مذکورۂ بالا معیار کے مطابق لکھنوی سمجھ لیا ہے تو اس سے بڑھ کر نادانی اور کیا ہوگی۔ کوئی تاریخ کوئی تذکرہ یہ ثابت نہیں کرتا کہ مذکورالصدر اساتذہ میں سے کوئی ایک بھی لکھنؤ میں پیدا ہوا۔ پھر ان پر لکھنوی ہونے کی حیثیت سے فخر کرنا چہ معنی دارد۔ بُرا ہو خود فراموشی بلکہ احسان فراموشی کا حضرات لکھنؤ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کن لوگوں کے دم قدم سے لکھنؤ لکھنؤ بنا۔ بندہ نواز یہ بیرونیوں ہی کا صدقہ ہے۔ کہ لکھنؤ نے یہ عظمت و شہرت حاصل کی۔ انہیں بیرونیوں میں ایک مرزا یگانہ بھی ہیں جنہوں نے لکھنؤ کی پرانی دقیانوسی شاعری پر پانی پھیر کر حقیقی و وجدانی شاعری کی تازہ روح پھونک دی جس پر فقط لکھنؤ ہی نہیں بلکہ ایشیائی شاعری جس قدر ناز کرے کم ہے۔ اب تو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ صحیح معنے میں لکھنوی کون ہے۔

یاس نام آورم فاتح لکھنو

(تضمین)

اسمعوا افہموا اسمعوا افہموا

منم کہ آئینہ حق نما برائے خودم
منم کہ مشتریِ جنس بے بہائے خودم

منم کہ چارہ گر و درد آشنائے خودم
منم کہ درد خدادادم و دوائے خودم

منم کہ سر نمی آرم بہ سجدۂ ناحق
منم کہ در رہِ حق محو نقش پائے خودم

منم کہ منتظر انقلاب مے باشم
منم کہ سلسلہ جنبانِ غم برائے خودم

منم کہ منزل مقصود زیر پا دارم
شکستہ پایم و تاہم بہ مدعائے خودم

قدم زغمکدۂ خود چہ می نہم بیروں　　　گدائے خاک نشینم و لے گدائے خودم
ہزار فتنہ بپا گشت و من خبر نشدم　　　ہزار کوہ شد از جائے و من بجائے خودم
صلائے نطق گرادادمے بزاغستان　　　کہ عندلیب ہم آہنگ و ہمنوائے خودم

منم کہ لکھنو را جان تازہ دادم
منم خدائے سخن یاس و ناخدائے خودم

دیباچہ میں ناظرین ملاحظہ کرچکے ہیں کہ اظہار فضیلت (جسے عوام الناس اپنی کوتاہ نظری سے خودستائی پر محمول کرتے اور مذموم سمجھتے ہیں) دنیا کی برگزیدہ شخصیتوں کی طرف سے مذموم نہیں بلکہ بعض اوقات ناگوار تبلیغی فرض ٹھہر جاتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس اظہار فضیلت سے کوتاہ نظر عوام الناس کی ہدایت و تلقین مقصود ہو۔ حضرت علی مرتضیٰ ایسے پاک نفس بزرگ کو بھی زندگی میں ایسے مواقع پیش آ گئے تھے اور آپ نے خطبہ شقشقیہ میں اپنے فضائل و مراتب اپنی زبان مبارک سے بیان فرمائے ہیں۔ اس میں ہرگز نفسانیت کو دخل نہ تھا بلکہ پبلک کی تنبیہ و تلقین مقصود تھی۔

دنیا ہمیشہ سے مردہ پرستی کے مرض میں مبتلا رہی ہے اور رہے گی۔ مگر اخلاقی ریفارمر ایسے مریضوں کے ازالۂ مرض کے لئے کبھی کبھی داروئے تلخ سے بھی کام لیتے رہے ہیں۔ مردہ پرستی تو عام وبا ہے مگر لکھنؤ اس وبا کے علاوہ فرعونیت کے مرض میں بھی مبتلا ہے جس کے ازالہ کے لئے مصنف نے ۱۹۲۰ء میں یہ ترانہ شقشقیہ تصنیف کیا جس میں اظہار فضیلت کا ناگوار فرض ادا کرکے ناواقفوں کی تلقین و تنبیہ فرمائی ہے۔ خودشناسی و خودداری جذبہ حریت و آزادی۔ استقلال

و بامردی، جو مصنف کے کیرکٹر کی نمایاں خصوصیات ہیں اس نظم کے ایک ایک لفظ سے واضح ہیں مصنف نے اپنی خداداد شاعرانہ استعداد سے لکھنو کی شاعری میں جو تازہ روح پھونکی ہے اُس سے انکار کی مجال کسے ہوسکتی ہے مگر لکھنؤ کو زاغستان کہنا بعید از انصاف معلوم ہوتا ہے۔ شاید مصنف نے اپنے معیار سخنوری کے مقابلہ میں لکھنؤ کو زاغستان ٹھہرا کر ایک حقیقت تلخ کا اظہار فرمایا ہے ورنہ لکھنو نے پچھلی صدی میں اردو زبان کی جو خدمت کی ہے اس کا خود مصنف کو بھی اقرار ہوگا۔

(ماسٹر پیس) **موج ہوا سے خاک اگر آشنا نہ ہو**
دنیائے گرد باد کی نشو و نما نہ ہو

موج ہوا سے دنیائے گرد باد کا وجود میں آنا اور پھر صورت نشو و نما اختیار کرنا بھلا اس قوت تخیل و اختراع کا کیا ٹھکانا ہے۔ اتنی نازک اور گہری حقیقتیں اس آسانی اور برجستگی سے قلمبند کردینا کم از کم غالب کے لئے تو نہایت مشکل تھا غالب کا ذہن اگر اس حقیقت کی طرف منتقل بھی ہوتا تو نہ جانے کس قدر الجھا کر بیان کرتے اور پھر بھی بیان نہ کرسکتے۔

صورت نہ پکڑے جلوۂ بے معنی حباب
قطرہ اگر اسیر طلسم ہوا نہ ہو

دنیا کا سارا کارخانہ ہوا پر ہے۔ حباب کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ اک ہوائی طلسم ہے۔ اک جلوۂ بے معنی ہے جس کی ساری نمود ہوا کے دم

سے ہے۔ قطرہ میں ہوا نہ بھرے تو حباب کی جلوہ آرائی کیونکر ہو۔ انسانی وحیوانی زندگی کیا ہے یہ بھی محض ہوائی کارخانہ ہے۔ دیکھو یہ فلسفیانہ حقایق کتنے روشن الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں کمال سخنوری یہ ہے کہ فلسفہ بھی شعریت میں غرق ہو جائے۔ اگر یہی حقایق دیوزاد کی زبان میں قلمبند کئے جاتے تو شعریت کا جوہر خاک میں مل جاتا۔

دل کو جلا کے سرمۂ بینش بنایئے
آنکھوں سے معرفت کا اگر حق ادا نہ ہو

کہتا ہے کہ اگر نظر میں اتنی قوت نہیں کہ کمال معرفت تک پہنچا سکے تو دل میں سوز وگداز پیدا کر کیونکہ معرفت کا بہترین نسخہ یہی ہے۔ یہیں سے فلسفی اور شاعر کا فرق مراتب معلوم ہو جاتا ہے۔ فلسفی محض نظر کی قوت سے کام لے سکتا ہے اس وجہ سے کسب کمالِ معرفت میں ادھورا رہ جاتا ہے۔ مگر شاعر ذوق نظر کے ساتھ دل کے سوز وگداز سے کمال معرفت تک پہنچتا ہے۔

ایسا نہ ہو کہ تھک کے کہیں بیٹھ جائے دل
دیر وحرم میں گم نگہ نارسا نہ ہو

پار اترے کیا دوآبہ امید و بیم سے
جب ناخدائے دل کو یقین خدا نہ ہو
شکل اُسکی دیدنی بھی ہو نادیدنی بھی ہے
جو تجھ کو جانتا ہو مگر مانتا نہ ہو

دنیا میں کون سا بشر ہے جو خدا کو جانتا ہو مگر مانتا نہ ہو۔ اور اگر کوئی ایسا ہے تو اس کی شکل دیکھنے کے قابل ہے اور نہیں بھی ہے نادیدنی تو اس وجہ سے کہ جو کمبخت خدا کو پہچان کر بھی نہ مانے تو اُس کی منحوس شکل کوئی کیوں دیکھے۔ اور دیدنی اس وجہ سے کہ ایسے کمبخت منکر کو ایک بار دفع حیرت کے لئے ضرور دیکھ لینا چاہیئے کہ ایسا انسان بھی کوئی ہو سکتا ہے جو خدا کو پہچان کر بھی منکر ہو۔

سجدہ وہ کیا کہ سر کو جھکا کر اُٹھا لیا
بندہ وہ ہے جو بندۂ بندہ نما نہ ہو

کمال بندگی کی حد دکھاتی ہے۔ سجدہ تو وہی ہے کہ سر جھکا سو جھکا پھر اُٹھنا کیسا۔ جس نے سر جھکا کر اُٹھا لیا وہ صحیح معنی میں بندہ نہیں ہے بلکہ بندۂ بندہ نما ہے۔

آمین تک زبان سے نکلتی نہیں یہ کیا؟
مغرور اتنا اے دلِ بے مدعا نہ ہو

احسان کس کا مانئے کس کا نہ مانئے
پردہ میں ناخدا کے کوئی دوسرا نہ ہو

دل کھول کر تڑپنے دے اے صبر الوداع
پرہیز کیوں کروں جب امیدِ شفا نہ ہو

امید صلح کیا ہو کسی حق پسند سے
پیچھے وہ کیا ہٹے گا جو حد سے بڑھا نہ ہو

صلح کا یہ فلسفہ بھی غالباً اچھوتا ہے۔ پہلا مصرع بظاہر کتنا انوکھا بلکہ بے تکا معلوم ہوتا ہے۔ حق پسند سے صلح کی امید نہ ہوگی تو اور کس سے ہوگی مگر دوسرے مصرع سے اس انوکھی بات کو کتنی گہری حقیقت سے مطابق کر دیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا میں جو صلح کا دستور ہے وہ یہ ہے کہ فریقین میں سے دونوں کو کچھ نہ کچھ دبنا پڑتا ہے۔ کچھ ہم دبے کچھ تم دبے چلو صلح ہو گئی۔ مگر ایک حق پسند سے ہرگز امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ کبھی اپنے جادہ سے ہٹ جائے گا حق پسند تو حد اعتدال سے نہ آگے بڑھتا ہے نہ پیچھے ہٹتا ہے اپنے مقام پر قائم رہتا ہے۔ پھر اُس سے پیچھے ہٹنے اور صلح کر لینے کی امید کیونکر ہو سکتی۔ پیچھے ہٹنا وہی گوارا کر سکتا ہے جو حد اعتدال سے تجاوز کر گیا ہو۔ حق پسند جب حد سے تجاوز ہی نہیں کر سکتا تو وہ صلح کر لینے پر آمادہ کیوں ہوگا؟ کیا غالب کا دیوان اس لاجواب فلسفہ صلح کی مثال پیش کر سکتا ہے؟

دل نشہ خودی میں پڑا جھومتا ہے کیا
زور آزمائی کو کوئی درد اُٹھ کھڑا نہ ہوا
پچھلا پہر ہے کاتب اعمال ہوشیار
آمادۂ گناہ کوئی جاگتا نہ ہو

ان اشعار کی شرح پر قلم فرسائی کیا کروں. غور کرنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یاسؔ آپ کو خدا کی خدائی سے کیا غرض
وحدت سرائے دل میں کوئی دوسرا نہ ہو

تار نظر نے باندھ لیا ہے بہار کو
نیرنگیٔ تصوّر بے اعتبار کو

ہم خزاں پہ یاسؔ لٹادو بہار کو
بازیچۂ دو رنگیٔ لیل و نہار کو

یہ وہ غزل ہے جو دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن کے مشاعرہ کے لئے ۱۹۲۲ء میں کہی گئی تھی جس میں شعرائے لکھنؤ نے مرزا صاحب کا بائیکاٹ کیا تھا دونوں مطلعوں کی لطافت و نزاکت معنوی کا کیا کہنا. بہار کو "نیرنگی تصور بے اعتبار" اور "بازیچہ دو رنگی لیل و نہار" سے تعبیر کرنا قوت اختراعی کی تازہ کاری ہے. "تار نظر نے باندھ لیا ہے بہار کو" اس کیفیتِ تصور اور اس زبان آوری کی تو دید ہے نہ شنید۔

دے کچھ تو داد طبع ندامت شعار کو
کیا دیکھتا ہے لغزشِ بے اختیار کو

فطرت کی مجبوری و بے اختیاری سے لغزش ہو گئی تو اس لغزش کو کیا دیکھتا ہے کیوں باز پرس کرتا ہے۔ تجھے تو میری طبع ندامت شعار کی داد دینا چاہئے

کہ گو میں خطا و لغزش پر مجبور تھا مگر اس پر بھی نادم ہوں ورنہ مجبوری کے ساتھ ندامت کیسی

دیدار تو دکھائے کہیں صبحِ منتظر
حاضر ہے سر بھی سجدۂ بے اختیار کو

صبح قیامت کو صبح منتظر کہنا کتنا تازہ اور کتنا دلکش تصرف ہے اسی طرح سجدۂ بے اختیار کی تازگی ترکیب سے شوق نیاز کی حد معلوم ہوتی ہے۔ صبح منتظر یعنی صبح قیامت کہیں جلوہ گر تو ہو میں تو ہر وقت سر نیاز جھکا دینے کے لئے حاضر ہوں۔

خانہ خراب عشق نے دل میں پناہ لی
دار الامان سمجھ کے اس اُجڑے دیار کو

دل کو اُجڑا دیار کہنا تو کوئی بڑی بات نہیں ہے مگر دار الامان سے تعبیر کرنا اور پھر عشق کا اس دار الامان میں پناہ لینا کتنی جدت ہے۔

کچھ ہوش ہو تو آنکھوں ہی آنکھوں میں تولئے
آغاز پُر فریب سے انجام کار کو
(آغاز پُر فریب)

دل نے بزورِ عشق لگایا ہے راہ پر
گم گشتگانِ غمکدۂ روزگار کو

بیگانہ وار ایک ہی رخ سے نہ دیکھئے
دنیا کے ہر مشاہدۂ ناگوار کو

میزانِ عدل آئی اب ایسوں کے ہاتھ میں
کانٹوں سے تولتے ہیں جو پھولوں کے ہار کو
یاد آئی آشیانۂ پُرخار کی خلش
دل ڈھونڈھتا ہے پھر اُسی اُجڑے دیار کو

اللہ رے حبِ وطن۔ دل پھر اُسی اُجڑے دیار اُسی آشیانۂ پُرخار کی خلش کا خواہاں ہے۔ وطن میں دوست دشمن سبھی ہوتے ہیں۔ دشمنوں کی عداوت کے لحاظ سے وطن کو آشیانۂ پُرخار کہا ہے۔ اور یہ تازہ ترکیب بجائے خود ایک تصنیف کی قیمت رکھتی ہے۔

منہدی بندھی نہیں مرے پائے خیال میں
چاہوں تو کھینچ لاؤں گزشتہ بہار کو
حیرت نے شش جہت میں نظر بند کر دیا
نامحرمِ طلسمِ خزاں و بہار کو
ہم ایسے بدنصیب۔ گرفتارِ آشیان
کیا جانیں گرم و سردِ خزاں و بہار کو
آج آشیان بھی اُن پہ ہے بارِ خوشی کے تنگ
روتے تھے کل جو کشمکشِ ناگوار کو

کل تک جو کشمکشِ قفس کا رونا رو رہے تھے آج آزاد ہو کر خوشی کے مارے آشیان بھی اُن پر تنگ ہے۔ کیا کہنا ہے اس جودت ذہن کا۔ آشیانہ اور قفس کی زندگی جداگانہ عالم رکھتی ہے مگر فکر رسا نے دو جداگانہ حالتوں میں سے قدر مشترک نکال کر کے نیا جہانِ معنی پیدا کر دیا۔

بادِ سحر کجا پر پروانہ شام سے
بھڑکا رہے تھے شعلہ بے اختیار کو

سہو و خطا ودیعتِ فطرت سہی مگر
سمجھاؤں کیا ضمیرِ ملامت شعار کو

غالب نے اتنی عمر پائی مگر ضمیر ملامت شعار کی حقیقت پر کوئی روشنی نہ ڈالی تو کچھ نہ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ فطرت انسانی مجبور محض ہے سہو و خطا اُسکی فطرت میں روزِ ازل سے ودیعت کی گئی ہے مگر اس پر بھی ضمیر ملامت شعار کی خلش اُسے بے چین رکھتی ہے۔ اللہ اکبر کیا کشمکش ہے۔ ایسے اشعار جس کے قلم سے نکلیں وہ سرزمین ہند میں فاقہ کشی و بدحالی کی زندگی بسر کرے۔ ایسا ملک کیا ترقی کرے گا۔

اللہ رے اختیار کہ آمادہ کر لیا
فکرِ محال پر دلِ بے اختیار کو

ٹگور و غالب کا کیا ذکر ہے دنیا کے اکابر شعرا میں سے جس کسی کے حصہ میں

ایسا شعر آتا تو قوم کی قوم اُسے سرمایہ ناز سمجھتی۔ انسان کا فاعل مختار ہونا تو کسی کی سمجھ میں آیا ہے نہ آئے گا۔ اختیار یا قدرت جو کچھ بھی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کسی بات کا ارادہ کر کے مستعد ہو جائے اور بس۔ مگر کوئی بندۂ خدا ایسا نظر نہ آیا جو اپنے ارادہ کو عمل تک پہنچانے کی ذمہ داری کر سکتا فکر و ارادہ کا کیا کہنا۔ ممکن تو ممکن ہے محال کی فکر بھی کی جا سکتی ہے اور کی جاتی ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ہم فکر سے زیادہ بھی کچھ کر سکتے ہیں؟ عمل تک ہمارا دسترس ہے؟ اس کا جواب صفر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسی پر شاعر جل کر کہتا ہے کہ اللہ رے اختیار کہ ہم نے فکر محال پر بھی اپنے دل بے اختیار کو آمادہ کر لیا بس آگے آیت۔ سبحان اللہ کیا اختیار ہے دیکھو اس irony نے شعر کو کتنا بلند کر دیا۔

ساحل کہاں دو آبۂ امید و بیم کا؟
تہ پر بٹھا دو یاس دل بے قرار کو

چلتے چلتے بھی ظالم نے دُو آبۂ امید و بیم کا وہ تیر مارا جس کی پناہ نہیں۔ خدا سمجھے ایسے شاعر سے۔

*

نظر آئیگا کیا ظلمتکدہ میں چشم حیران کو
اندھیرے کا اُجالا جانئے خواب پریشان کو

یہ ماسٹر پیس مصنف کے دوران قیام علی گڑھ کی یادگار ہے۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کی جوبلی کے موقع پر ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا جسکی ایک

نشست میں مرزا صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔

روح اس ظلمتکدۂ دہر میں جلوۂ حقیقت کو ترستی ہے اور ترستی رہے گی۔ چشم حیران کو خواب پریشان کے سوا حسن حقیقت کا دیدار کیا میسر آئے گا اسی خواب پریشان کو غنیمت سمجھو اسی کو اندھیرے کا اُجالا جانو اس حکیمانہ و عارفانہ احساس کو ایسی الہامی زبان میں (اندھیرے کا اُجالا جانئے) ادا کر دینا جمہور اساتذہ کی طاقت سے بالاتر ہے۔ کاش آج غالب زندہ ہوتے اور دیکھتے۔

یہ کس نے گرم رفتار فنا کی راہ کھوٹی کی؟
بٹھا کر پردۂ فانوس میں شمع شبستان کو

پردۂ فانوس کے حائل ہونے سے گرم رفتار فنا (پروانوں) کی راہ کھوٹی ہونا کیا اس پرواز فکر۔ اس حسن معنی اس معجز بیانی کا اعتراف صحیح عرفی و غالب کے سوا اور کسی سے ممکن ہوتا؟

دل بیدار گھبرائے نہ کیوں اس اندھی نگری میں
نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں اک دیار بے شبستان کو

دیار بے شبستان یعنی وہ عالم جہاں دن ہی دن ہو رات کا نام نہ ہو۔ دیکھو۔ اس ایک لفظ سے سلسلہ خیال کو کہاں سے کہاں تک جنبش ہو جاتی ہے۔

دل بیدار اس اندھی نگری اس ظلمت کدۂ ہستی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے مگر جدھر دیکھو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ آنکھیں جلوہ گاہ انوار سرمدی کو ترستی

ہیں خدا جانے مرزا غالب نے کبھی ان کیفیات وجدانی کا مرقع کھینچا یا نہیں اور
کھینچا بھی تو کس زبان میں کس انداز سے۔

(طلسم رنگ و بو)

طلسم رنگ و بو کیسا فریب آرزو کیسا
اُٹھا کر رکھ دیا جب طاقِ نسیاں پر گلستاں کو

(اسیروں کی خاموشی)

اسیروں کی یہ خاموشی کسی دن گُل کھلائیگی
قفس سے چھوٹ کر سر پر اُٹھا لینگے گلستاں کو

(ذوقِ ناپشیمان)

مزاج حسن بدلے آسماں بدلے زمیں بدلے
سزائے عشق کیا بدلیگی ذوقِ ناپشیماں کو

ایک ایک شعر کو پڑھو معلوم ہوتا ہے مضامین عالیہ کا بحر مواج امنڈتا آرہا
ہے زبان کی رنگینی معانی کی کثرت جذبات کا جوش و خروش کن کن خوبیوں پر
نظر کی جائے مزاج حسن بدلے۔ آسمان بدلے۔ زمین بدلے۔ قُدری ہو جائے۔
قیامت آجائے کتنی ہی سخت سزا دی جائے مگر ذوق ناپشیمان جرم عشق
پر نادم نہیں ہو سکتا۔ بھلا اس تلاطم احساسات۔ اس زور بیان اور ذوق ناپشیمان
کی Unashamed کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ کیا ان آیات وجدانی
اور اُردو لٹریچر کے ان ارتقائی کارناموں کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی دیوان غالب

منسوخ نہ سمجھا جائے گا۔

ترا دیوانہ کیوں آزادی موہوم کی دھن میں
سر اپنا آپ پھوڑے توڑ کر زنجیر احسان کو

بندہ زنجیر احسان سے آزاد ہو تو کیونکر ہو اور کیوں ہو۔ اس آزادی موہوم کی دُھن میں اگر زنجیر توڑ بھی ڈالے یعنی تیرے احسان سے انکار کی جرات کرے تو آخر میں فرط ندامت سے خود اپنا سر پھوڑنے پر مجبور ہو گا۔ پھر ایسی نادانی و احسان فراموشی کیوں کرے۔ سبحان اللہ۔ کیا جذبہ عبودیت ہے۔

(دل بے حوصلہ)

دل بے حوصلہ کیا اور شوق خیر مقدم کیا
بتا دیتا ہے رستہ خانۂ در بستہ مہمان کو

بھلا دل بے حوصلہ مہمان کا خیر مقدم کیا کرے گا۔ مہمان کوئی آتا بھی ہے تو خانہ در بستہ مہمان کو سیدھا رستہ بتا دیتا ہے کہ میاں اپنی راہ لو۔ دل بے حوصلہ کی حقیقت خانہ در بستہ ہی سے آشکارا ہے۔

(حسن پشیمان)

سراپا غرق ہو کر لذتِ ترکِ تماشا میں
دکھاؤں گا تماشا ایک دن حُسنِ پشیمان کو

حسن آج جتنا چاہے اپنی بہار پر اُٹھلائے اور تشنگان دید سے اغماض کرے اک دن وہ بھی آنے والا ہے کہ حسن کو اپنے زوال پر پشیمان ہونا پڑے گا۔ آج تو ہم دیدار کو ترستے ہیں۔ ایک دن وہ بھی ہو گا کہ خود حسن میری اک نگاہ غلط انداز کو ترسے گا۔ اور ہم لذت ترک تماشا میں ڈوب کر حُسن کو غرور کا مزہ چکھا دیں گے۔

جذبات کی یہ گہرائیاں کیفیات نفسی کی یہ نزاکتیں اس زبان آوری کے ساتھ اُردو لٹریچر میں کہیں اور تو کیا غالب کے ہاں بھی ہوں تو بڑی بات ہے۔

(مرزا یاس عظیم آبادی)

گرفتاران ساحل کود پڑتے ڈر نکل جاتا
کبھی تو زیست مشکل آزماتی مرگ آسان کو

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ قیامت خیز نفسیاتی حقایق اردو لٹریچر کیا فارسی کے وسیع لٹریچر میں بھی نظر آسکیں گے کہتا ہے کہ ارے ناوانو اس کٹھن زندگی کو تم نے خواہ مخواہ گلے باندھ لیا ہے موت تو اس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ آسان ہے۔ کبھی تو اس آسان مرحلہ کی آزمایش کی ہوتی دریائے فنا کا ہول تمہارے دل میں جھوٹ موٹ سمایا ہوا ہے ساحل پر آپ سے آپ بندھے کھڑے ہو۔ ارے یہ دریائے فنا کچھ بھی نہیں ہے۔ کود پڑا بھی ڈر نکل جائے۔ خدا کی پناہ۔ ان تلاطم خیز جذبات کی مصوّری اس آسانی کے ساتھ۔ خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست۔ کیا براہ کرم ٹگور و غالب کا مطالعہ کرنے والے مرزا یاؔس کے ان اشعار کے مقابلے میں ایسے ہی مکمل نمونے پیش کر سکتے ہیں۔

(مرزا یاس لکھنوی)

مبارک ہو مبارک ساحل رحمت پہ دم لینا
قدم مارا تو ڈر کیا پار جا دریائے عصیاں کو

نیکی ہو خواہ بدی ہو جو کام کرو پورے حوصلہ کے ساتھ کرو۔ تذبذب کیسا۔ دریائے عصیان میں قدم مارا تو پس و پیش کیسا۔ چلے چلو۔ دل کھول کر گناہ کر

لو اور ساحل رحمت پہ پہنچکر دم لو۔ خوف خدا بھی اور شوق گناہ بھی یہ دودلی کیسی۔ دریائے عصیان سے پار اُتر کر دیکھو تو سہی ساحل رحمت کتنا وسیع ہے۔ رحمت خداوندی اور شوق گناہ پر اساتذہ کے ہزاروں اشعار ملیں گے۔ مگر یہ زور شور یہ جوش وخروش اور کہیں شاید ہی نظر آئے۔

دل دیوانہ مجھ کو کس بلا کے بن میں لے آیا
اسی میں خیر ہے پھر لے چل اُلٹے پاؤں زنداں کو

جانوروں کا ذکر نہیں مگر کوئی انسان تو یہ شعر سننے کی تاب نہیں لاسکتا۔ اسی کیفیت کو مرزا غالب نے بھی اک جگہ کمال سادگی کے ساتھ قلمبند کیا ہے ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

مگر گستاخی معاف ان دونوں اشعار میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ غالب کو تو دشت کی ویرانی دیکھ کر گھر یاد آیا اور گھر پھر بھی گھر ہے مرزا یاس اُس بلا کے بن کی وحشت انگیزی کا ذکر کر رہے ہیں جس کے مقابلہ میں گھر تو کیا زندان بھی ہزار درجہ بہتر ہے۔ 'پھر لے چل اُلٹے پاؤں زندان کو' اس سے اندازہ کر لو کہ جس 'بلا کے بن' کو دیکھ کر زندان بلا کی طرف پلٹ چلنے کی آرزو پیدا ہو وہ کتنا ہولناک ہوگا۔ الاماں! اس کے بعد اس بات پر بھی غور کرو کہ مرزا غالب کے 'دشت' کے مقابلہ میں مرزا یاس نے 'بلا کا بن' کہا ہے اور بلا کا در دبھر دیا ہے محض 'دشت' اور 'بلا کے بن' میں بڑا تفاوت ہے۔

گناہِ بے حقیقت کو قلم نے کتنا چمکایا
پھڑک اُٹھتا ہوں میں جب دیکھتا ہوں فردِ عصیاں کو

گناہ تو ہمارے کچھ ایسا وزن نہ رکھتے تھے مگر کاتب اعمال کے زورِ قلم نے بے حقیقت گناہوں پر ایسی رنگ آمیزی کی اتنا چمکایا کہ دیکھ کر دل پھڑک اُٹھتا ہے اور زورِ قلم کی داد دینا پڑتی ہے۔

(مجبوری)

ارادہ سے عمل تک کچھ تو اپنا دسترس ہوتا
بغل میں پالتے کیوں پاس دل کے دشمنِ جاں کو

اللہ اکبر۔ انسان کتنا مجبور ہے۔ کون شخص اپنے دشمن کو پالنا گوارا کرتا ہے مگر مجبوراً گوارا ہی کرنا پڑتا ہے۔ فرعون کو حضرت موسیٰ کی پرورش کرنا پڑی تو ہم دل سے دشمن کو پالنے پر کیوں نہ مجبور ہوتے ؟

(فنا و بقا)

اپنی ہستی خود ہم آغوشِ فنا ہو جائے گی
موجِ دریا آپ ساحل آشنا ہو جائے گی

(قطعِ امید)

تہ کا اندیشہ رہے گا پھر نہ ساحل کی ہوس
دل سے جب قطعِ امیدِ بیوفا ہو جائے گی

(پردۂ انقلاب)

شب کی شب بزمِ طرب ہے پردہ دارِ انقلاب
صبح تک آئینہ عبرت نما ہو جائے گی

(شرم و حیا جانِ ایمان)

جانِ ایمان ہے اُٹھی وہ آنکھ شرمائی ہوئی
کیفیت میں ڈوب کر کیا جانے کیا ہو جائیگی

(فنا میں بقا)

کارگاہِ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے
اک طرف اُجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے

فنا میں بقا کی تصویر ملاحظہ ہو۔ روح تو ازلی و ابدی ہے اس کا ذکر۔ مادہ کو بھی فنا نہیں۔ فقط تغیر و انقلابِ صورت کا نام فنا رکھ لیا گیا ہے۔ ایک طرف اُجڑنے دوسری طرف بسنے کے یہ معنی ہیں کہ سلسلہ کون و فساد نا متناہی ہے۔

(حسن بے تماشا)

حُسنِ بے تماشا کی دھوم کیا مُعَمّا ہے؟
کان بھی ہیں نامحرم آنکھ بھی ترستی ہے

حُسنِ بے تماشا یعنی حسن حقیقت کی دھوم ہی دھوم ہے۔ نہ کانوں نے آواز سُنی نہ آنکھوں نے نظارہ کیا؟

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سُراغ باطن کا
چال سے تو کافر پہ سادگی برستی ہے

اندازِ حُسن کی کیسی دلکش تصویر کھینچی ہے۔ شعر کی خوبی یہ ہے کہ سنتے ہی

آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوندنے لگے۔

(فلسفۂ پارسائی)

ترکِ لذتِ دنیا کیجئے تو کس دل سے

ذوقِ پارسائی کیا فیضِ تنگدستی ہے

ذوق پارسائی کا یہ فلسفہ بھی کس قدر حقیقت و صداقت سے لبریز ہے۔ لذت دنیا کا ترک کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ یہ محض تنگدستی کا فیض ہے کہ لوگ پارسائی کا دم بھرتے ہیں۔ "فیض تنگدستی" کی Irony کس قیامت کی ہے

بیدلوں کی ہستی کیا جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

خواب ہے نہ بیداری ہوش ہے نہ مستی ہے

اللہ اکبر کس سادگی کس جوش و خروش کس تفصیل سے اس وجدانی کیفیت کو بیان کیا ہے فلسفی کی زبان اس اجتماع نقیضین پر روشنی ڈالنے سے عاجز ہے۔

(کیمیائے دل)

کیمیائے دل کیا ہے خاک ہے مگر کیسی؟

لیجئے تو مہنگی ہے بیچئے تو سستی ہے

(فلسفۂ خود پرستی)

کیا بتاؤں کیا ہوں میں قدرت خدا ہوں میں

میری خود پرستی بھی عین حق پرستی ہے

(خودداری)

خضرِ منزل اپنا ہوں اپنی راہ چلتا ہوں

میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

(فکر کی بلندی)

کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا

فکر کی بلندی یا حوصلہ کی پستی ہے

ان اشعار پر کچھ لکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اشعار کے پڑھنے سے جو محویت طاری ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ حوصلہ کی پستی اور فکر کی بلندی دونوں حالتوں میں سفر ناتمام رہتا ہے۔ فکر کی بلندی کوئی حد و نہایت نہیں رکھتی۔

(ہجومِ غم)

دیدنی ہے یاس اپنے رنج و غم کی طغیانی
جھوم جھوم کر کیا کیا یہ گھٹا برستی ہے

(ترکِ خیالِ خام)

ترک گفتن بہ خیالِ خام را
دامنِ آغازِ بے انجام را

(آغازِ بے انجام)

نے سوادِ منزلے نے ساحلے
گرد باد و موج بے آرام را

(دیدۂ کوتاہ نظر)

دیدۂ نامحرم فردائے ما
خوش نگرد آغازِ نیک انجام را

(کوتاہ بینی کی سزا)
کور تر خواہیم دخارے بشکنیم
دیدۂ نامحرمِ انجام را

(صنعتِ فطرت)
صنعتِ مشاطۂ فطرت دہد
جلوۂ نو حسنِ صبح و شام را

(شبستان عدم)
دخل نبود در شبستان عدم
فتنۂ بیدارِ صبح و شام را

(دل بے مدعا)
نیست جائے در دلِ بے مدعا
خار خارِ کوشش ناکام را

(فتنہ فردا)
فتنۂ فردا بہ فریادم رسید
شکر گویم حشر بے ہنگام را

(طلب یکسوئی)
آنکہ جوید کعبۂ خلوت مثال
ترک گوید سجدہ گاہ عام[1] را

(درد خوش انجام)
مژدۂ غم مے زند ناخن بہ دل
مبتلائے درد خوش انجام را

(دار الامان بیدلی)
یاس در دار الامانِ بیدلی
"خاک بر سر کن غم ایام را"

خواجہ حافظ کا مقابلہ کیا۔ مگر ہاں اس تحفۂ ہند کو بھی دیکھ لو۔

---

[1] سجدہ گاہ عام کعبہ سے مراد ہے۔

(ویرانوں کی زبانِ حال) (۱)

آ رہی ہے یہ صدا کان میں ویرانوں سے
کل کی ہے بات کہ آباد تھے دیوانوں سے

(وحشت کا تقاضا) (۲)

لے چلی وحشتِ دل کھینچ کے صحرا کی طرف
ٹھنڈی ٹھنڈی جو ہوا آئی بیابانوں سے

(کوچۂ جاناں کی کشش) (۳)

پاؤں پکڑے نہ کہیں کوچۂ جاناں کی زمین
خاک اُڑاتا جو نکل آؤں بیابانوں سے

(دستِ جنوں) (۴)

تنکے چن جا کے کسی کوچہ میں او دستِ جنوں
کیوں اُلجھتا ہے عبث چاک گریبانوں سے

(آمدِ بہار) (۵)

آج ہی کل میں ہے چلنے کو نسیمِ وحشت
تنگ آنے لگے دیوانے گریبانوں سے

(شوخ نگاہ کا اشارہ؟) (۶)

نہیں معلوم اُن آنکھوں کا اشارہ کیا تھا
جنگ پر تل گئے کفار مسلمانوں سے

(قفس کی زندگی) (۷)

آنکھ اُٹھا کر نہ کسی سمت قفس سے دیکھا
موسمِ گل کی خبر سنتے رہے کانوں سے

(شمع پروانہ کی رخصت)

پہ جلتے جلتے تو گلے شمع سے مل لیں اُٹھ کر
اب سحر ہوتی ہے کہہ دے کوئی پروانوں سے

(درد دل رونا)

کیا کوئی پوچھنے والا بھی اب اپنا نہ رہا
درد دل رونے لگے پاس جو بیگانوں سے

(قالب میں روح کی پریشانی)

درد دل روئیں کس امید پہ بیگانے سے
صبح ہونے کی نہیں یاس اس افسانے سے

(حسن معنی کی طلب)

ہوسِ عالمِ بالا نے کیا ہے دل تنگ
روح گھبرا گئی اب جسم کے کاشانے سے
حُسنِ معنی کے جو شیدا ہیں ادھر کیا دیکھیں
صورت آبادِ جہان کم نہیں ویرانے سے

(شمع پروانہ میں پردہ)

اور پردے کی ملاقات کریگی اندھیر
شمع کیوں چھپتی ہی فانوس میں پروانے سے

(دل کی لگی)

آگ میں کود پڑا دل کی لگی وہ شے ہے
آتش شوق کو پوچھے کوئی پروانے سے

(دلِ پُرکیفیت)

کیفیت سے کبھی خالی نہیں دل مستوں کا
ہو بہو ملتا ہے ساقی ترے پیمانے سے

(پیری کی ہوس)

ساقیا دل کی ہوس مٹ نہ سکی پیری میں
پیاس بجھتی نہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے سے

جام لبریز ہوا ہے کسی مجبور کا آج
بوے خون آتی ہے ساقی ترے پیمانے سے

(دیکھنے کی گنہگاری)

دور سے دیکھنے کے یاسؔ گنہگار ہیں بس
آشنا تک نہ ہوئے لب کبھی پیمانے سے

✻

(دوستی کی بیگانگی)

نظر آئے جب آثارِ جدائی رنگ محفل سے
نگاہ یاسؔ بیگانہ ہوئی یاران یکدل سے

لکھنؤ میں مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا مرحوم و مغفور نے اک عظیم الشان مشاعرہ کیا تھا۔ یہ غزل اُسی مشاعرہ کا ماسٹر پیس ہے لکھنؤ کے قریباً تمام شعرا کا مجمع تھا۔ مگر اس غزل پر شعرائے لکھنؤ اس طرح خاموش بیٹھے

رہے جیسے محفل کو سانپ سونگھ گیا ہو اس جوش تعصب وحسد۔ پر لکھنؤ جس قدر ناز کرے بجا ہے۔ زمانہ خود اس کا فیصلہ کرے گا کہ اُردو لٹریچر کا یہ کارنامہ کیا قدر و قیمت رکھتا ہے۔

(یادِ وطن)

لپٹتی ہے بہت یادِ وطن جب دامنِ دل سے
پلٹ کر اک سلامِ شوق کر لیتا ہوں منزل سے

کیا معلوم جذبہ حبِ وطن کا ایسا بے مثال مرقع ۔ غالب کے دیوان میں بھی مل سکے گا یا نہیں۔ اگر مل جاتے تو سبحان اللہ

(بہار اور خزاں کا تصور)

تصوّر لالہ و گل کا خزاں میں بھی نہیں مٹتا
نگاہِ شوق وابستہ ہے اب تک نقشِ باطل سے

(لذتِ اسیری)

نہیں معلوم کیا لذّت اُٹھاتی ہے اسیری میں
دلِ وحشی پھڑک اُٹھتا ہے آوازِ سلاسل سے

کسی شے میں نہ ہو گی بادۂ عرفاں کی گنجائش
لڑا لے ساغرِ جم کو بھی کوئی شیشۂ دل سے

تصور نے دکھایا شاہد مقصود کا جلوہ
اُتر آئی ہے لیلیٰ سرزمینِ دل پہ محمل سے

لیلیٰ کا محمل سے سرزمین دل پر اُتر آنا اس انداز بیان کی تازگی و ندرت کی مثال غالب کے ہاں موجود ہوتی تو ہم بہت خوش ہوتے۔

اُبھرنے کے نہیں بحرِ فنا میں ڈوبنے والے
دُرِ مقصود ہی گم ہے تو پھر کیا کام ساحل سے
کہاں تک پردۂ فانوس سے سر کی بلا ٹلتی
ازل سے لاگ تھی بادِ فنا کو شمع محفل سے

موت کا فلسفہ ایسے الہامی الفاظ میں کس نے بیان کیا؟

رہے گی چار دیوارِ عناصر درمیاں کب تک
اُٹھے گا زلزلہ اک دن اسی بیٹھے ہوئے دل سے

اسی فلسفہ کو غالب نے بھی بیان کیا ہے مگر کس بھونڈے طریقے سے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

غالب کا شعر نرا خشک فلسفہ ہو کر رہ گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ جنگل سے پکڑ پکڑ کر لائے گئے ہیں اور کٹہرے میں بند کر دیے گئے ہیں۔ مگر مرزا یاس نے

اُسی فلسفیانہ تخیل کو شعریت میں غرق کر دیا ہے۔ الفاظ کا ترنم اتنا دلکش کہ دشمن بھی گر پڑھے تو زبان پر مزہ رہے۔

یہیں سے سیر کر لو یاس اتنی دور کیوں جاؤ
عدم آباد کا ڈانڈا ملا ہے کوئے قاتل سے

موت آئی آنے دیجئے پروانہ کیجئے
منزل ہے ختم سجدۂ شکرانہ کیجئے

تا حشر ترکِ لذت ایذا نہ کیجئے
یعنی گناہ عشق سے توبہ نہ کیجئے

نا آشنائے حسن کو کیا اعتبارِ عشق
اندھوں کے آگے بیٹھ کے رویا نہ کیجئے

تہ کی خبر بھی لائے ساحل کے شوق میں
کوشش بقدرِ ہمت مردانہ کیجئے

وہ دن گئے کہ دلکو ہوس تھی گناہ کی
یادش بخیر ذکر اب اُس کا نہ کیجئے

(شوق گناہ۔ یادش بخیر)

ساون میں خاک اُڑتی ہو دل ہی ندھا ہوا
جی چاہتا ہے گریۂ مستانہ کیجئے

(گریہ مستانہ)

(کشش حسن)

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجئے

(فریب نفس)

فریبِ نفس کا جب احتمال ہوتا ہے

تو فرقِ عشق و ہوس بھی محال ہوتا ہے

(دادِ عشق و ہوس)

بقدرِ حوصلہ ملتی ہے دادِ عشق و ہوس

مزاج حُسن میں کیا اعتدال ہوتا ہے

(حسن و عیب کا فرق)

یہ عیب ہے کہ مٹائے سے مٹ نہیں سکتا

وہ حُسن ہے جو سریع الزوال ہوتا ہے

(خاک کا پتلا)

یہ کیا صفت ہے کہ ایک ایک خاک کا پتلا

جہاں میں آپ ہی اپنی مثال ہوتا ہے

(طلسم خیال)

نئی زمین نیا آسمان نئی دنیا

عجیب شے یہ طلسم خیال ہوتا ہے

(کتابِ عمر)

کتابِ عمر ہے گویا انیسِ تنہائی
نظر میں قصۂ ماضی و حال ہوتا ہے

(زندانِ آب و گل)

خراب ہو چلی زندانِ آب و گل کی ہوا
اب ایک سانس بھی لینا محال ہوتا ہے

(طلسمِ خیال کا ٹوٹنا)

امید و بیم کا کوسوں پتا نہیں ملتا
خراب جب یہ طلسمِ خیال ہوتا ہے

(زلالِ وُرد۔ دوائے خمار)

زلال وُورد ہیں دونوں دوائے در دخمار
بس ایک گھونٹ میں چہرہ بحال ہوتا ہے

(موت میں کیا شک)

خدا میں شک ہے تو ہو موت میں نہیں کوئی شک
مشاہدہ میں کہیں احتمال ہوتا ہے

(شوقِ فنا)

بھڑکتی جاتی ہے شوقِ فنا میں شمع کی لو
نسیمِ صبح سے اور اشتعال ہوتا ہے

(گناہِ بے لذت)

قفس میں ذکرِ نشیمن گناہِ بے لذت
نہ ہمزبان نہ کوئی ہم خیال ہوتا ہے

(پروانہ ایام فضول)

بہارِ عمر گزشتہ پہ بھیجئے صلوات
خزاں میں ذکر خزاں حسبِ حال ہوتا ہے

(گھر پھونک کر تماشا دیکھنا)

خزاں کی ضد پہ یہ باندھی ہی باغبان نے کمر
چمن کو آگ لگا کر نہال ہوتا ہے

(کاروان عدم)

نگاہ یاس سے اوجھل ہے کاروان عدم
جرس کے شور سے دل پائمال ہوتا ہی

اللہ اللہ. کیا شان سخنوری ہے. اوّل سے آخر تک زور قلم بڑھتا ہی گیا ہی نہ جانے غالب کے ہاں ایسی غزلیں کتنی ہیں جن میں کثرت مضامین کے ساتھ زور قلم سے اوّل سے آخر تک یکساں قائم رہا ہو. مرزا یاس کے ہاں تو ایسے بیسیوں نمونے موجود ہیں۔

حال دونوں کا ہی غیر. اب سامنا مشکل کا ہے
دل کو میرا درد ہی اور مجھ کو رونا دل کا ہے

(وحشت آباد جہان)

وحشت آباد جہان میں دل بہلنے کا نہیں
رنگ کچھ پہلے ہی سے بیرنگ اس محفل کا ہے

(پاسِ ادب)

واہ کیا کہنا ہے اے کوتاہیِ دستِ ہوس
دورِ آخر ہے مگر پاسِ ادب محفل کا ہے

(جذبۂ صادق)

جذبۂ صادق ہے اک صورت گرِ نازک خیال
جلوہ گاہ دل مرقع یار کی محفل کا ہے

رنگ لائی ہے بہار لالۂ خونیں کفن
صحن جنت اک نمونہ کوچۂ قاتل کا ہے

دھوپ میں ہیں تشنۂ دیدار لاکھوں جاں بلب
کیا قیامت خیز منظر کوچۂ قاتل کا ہے

(گہری نیند)

کشتگانِ ناز اب کروٹ بدلنے کے نہیں
نیند گہری منہ پہ سایہ دامن قاتل کا ہے

آپکے بیمار غم نے سختیاں جھیلیں بہت
شب بخیر اک اور دھاوا آخری منزل کا ہے

(مرحلہ آب و گل)

چار دیوار عناصر پھاندنا آسان نہیں
سخت مشکل مرحلہ زندانِ آب و گل کا ہے

(محیطِ عشق میں گم ہونا)

گم ہوئے ہوش و حواس ایسے محیطِ عشق میں
ڈوبنے والوں کو اب تہ پر گمان ساحل کا ہے

(معرفت)

سیکڑوں آوارۂ صحرا نظر آئے مگر
کوئی صورت آشنا بھی صاحب محمل کا ہے

(معرفت)

چشم نامحرم سے غافل روئے لیلیٰ ہے نہاں
ورنہ اک دھوکا ہی دھوکا پردۂ محمل کا ہے

(معرفت)

حضرت مجنوں کجا۔ نظارۂ لیلیٰ کجا
ایک پردہ آنکھ کا ہے دوسرا محمل کا ہے

(معرفت)

بھاگتا ہے یار آغوش تصور سے بھی دور
کچھ ٹھکانا یاس اس اندیشۂ باطل کا ہے

(فطرت اور خدا)

خداپرست بھی بندے ہیں حُسن فطرت کے
سمجھ میں آئے نہ راز اس طلسم حیرت کے

عقل و ادراک نہ خدا کی ہستی سے انکار کر سکتے ہیں نہ فطرت اور ناموس فطرت سے
دونوں قوتوں کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ عجب طلسم حیرت ہے جس کے راز سمجھ

ہیں نہیں آتے۔

(۱) سرِ حقیقت
ازل سے کیوں تپشِ بے سبب ہے ہر دل میں
کھلے نہ رازِ نہاں خانۂ حقیقت کے

(۲) خوابِ پریشان
دکھائی خوابِ پریشان نے سیرِ رنگا رنگ
بھرم کھلے نہ طلسماتِ بے حقیقت کے

(۳) منتظرِ انقلاب
ہمیشہ منتظرِ انقلاب رہتے ہیں
مزاجدان ہیں جو ہنگامہ زارِ فطرت کے

(۴) خیالِ خام یا ہمت کے ولولے
بلند و پست برابر ہیں اپنی آنکھوں میں
خیالِ خام ہے یا ولولے ہیں ہمت کے

(۵) حرم و دیر کا دوراہا
ٹھٹک رہے حرم و دیر کے دوراہے پر
خلاف جا نہ سکے شاہِ راہِ فطرت کے

(۶) فریادِ بے اجازت
پلٹ کے پھر وہی آوازِ بازگشت آئی
بڑھے نہ حوصلے فریادِ بے اجازت کے

(وعدہ فردا)

دکھائی موت نے تصویرِ وعدۂ فردا
ہوائے شوق نے پردے اُٹھائے غفلت کے

(وطن سے بیزاری)

وطن تو کیا ہے ہوائے وطن سے ہیں بیزار
لپٹ رہے جو بگولوں سے دشتِ غربت کے

(ناکامی)

گلا نہ کاٹ سکے اپنا وائے ناکامی
پہاڑ کاٹتے ہیں روز و شب مصیبت کے

(دنیا سے وفا کی امید غلط)

زمین پہ نور کے پتلوں نے کیوں ڈھہی دی ہے
کفن ملے تو سمجھنا دھنی تھے قسمت کے

(مشیت ازلی)

سعادتِ ابدی ہے مشیّتِ ازلی
ہوس فضول بھروسے پہ حُسنِ خدمت کے

(فلسفہ محبت)

اسی نے خاک کیا تھا اسی نے پاک کیا
خوشا نصیب جو پالے پڑے محبت کے

(عمِ فردا)

نگاہِ یاس ہے آئینۂ غمِ فردا
نظر کے سامنے سامان ہیں قیامت کے

جس شعر پر نظر کرو "کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا ایں جاست" اور مقطع نے تو قیامت ہی ڈھائی ہے۔

(دنیا کا تھیٹر)

غضب کی دھوم شبستانِ روزگار میں ہے
کشش بلا کی تماشائے ناگوار میں ہے

(نظارۂ فردا)

دکھائی آج ہی آنکھوں نے صورت فردا
خزاں کی سیر بھی ہنگامۂ بہار میں ہے

(بہار رفتہ کی دل لگی)

غبار بنکے لپٹتی ہے دامن دل سے
مٹے پہ بھی وہی دل لگی بہار میں ہے

(تصویر عشق)

دعائے شوق کجا۔ ایک ہاتھ ہی دل پر
اور ایک ہاتھ گریبانِ تار تار میں ہے

(امید و انتظار)

ہنوز گوش برآوازِ غیب ہے کوئی
امیدوارِ ازل اب تک انتظار میں ہے

(لذتِ انتظار)

قسم ہے وعدۂ صبر آزمائے جانان کی
کہ لذت ابدی ہے تو انتظار میں ہے

(دوا اور دعا)

دوائیں اور دعائیں تواب اثر معلوم
بس اک امیدِ اثر ضبطِ ناگوار میں ہے

چلے چلو دل دیوانہ کے اشارے پر
محال و ممکن سب اس کے اختیار میں ہے

سلامت رہیں دل میں گھر کرنے والے
اس اجڑے مکان میں بسر کرنے والے

گلے پر چھری کیوں نہیں پھیر دیتے
اسیروں کو بے بال و پر کرنے والے

(جلاوطنی)

اندھیرے اُجالے کہیں تو ملیں گے
وطن سے ہمیں دربدر کرنے والے

(دامن رحمت)

چھپے دامن ابر رحمت میں آخر
سیہ کاریوں میں بسر کرنے والے

(اپنے عیب کو دیکھو)

گریباں میں منہ ڈال کر خود تو دیکھیں
برائی پہ میری نظر کرنے والے

(طلسم حوادث)

طلسم حوادث کی تہ کو نہ پہونچے
زمانے پہ گہری نظر کرنے والے

(حقیقت کا مطالعہ)

اس آئینہ خانے میں کیا سر اُٹھاتے
حقیقت پر اپنی نظر کرنے والے

بہار دو روزہ سے دل کیا بہلتا
خبر کر چکے تھے خبر کرنے والے

(دیر و حرم کا دوراہا)

کھڑے ہیں دوراہے پہ دیر و حرم کے
تری جستجو میں سفر کرنے والے

(سخت جانی)

سرِ شام گل ہو گئی شمعِ بالیں
سلامت ہیں اب تک سحر کرنے والے

(کنجِ مرقد)

کجا صحنِ عالم کجا کنجِ مرقد
بسر کر رہے ہیں بسر کرنے والے

یگانہ وہی فاتحِ لکھنو ہیں
دلِ سنگ و آہن میں گھر کرنیوالے

(آہِ نارسا)

آہِ بیمار کارگر نہ ہوئی
چرخ کانپا مگر سحر نہ ہوئی

(صبحِ محشر)

صبحِ محشر ہوئی شبِ تاریک
صورتِ یار جلوہ گر نہ ہوئی

(شبِ امید)

شبِ امید کٹ گئی لیکن
زندگی اپنی مختصر نہ ہوئی

(دور کا نظارہ)

دور سے اُن کو آج دیکھ لیا
دل کو تسکین ہوئی مگر نہ ہوئی

(آنکھوں آنکھوں میں وعدہ)

آنکھوں آنکھوں میں لے لیا وعدہ
کانوں کان ایک کو خبر نہ ہوئی

(چشم عتاب)

اُف ری چشم عتاب اُف رے جلال
برق سوزاں ہوئی نظر نہ ہوئی

(آغاز و انجام)

فکر انجام و حسرتِ آغاز
دو گھڑی چین سے بسر نہ ہوئی

(در توبہ)

کھلنے والا نہیں درِ توبہ
فکر انجام وقت پر نہ ہوئی

(گریۂ خشک)

ایسا رونا بھی کوئی رونا ہے
آستین آنسوؤں سے تر نہ ہوئی

(بیمار کا پاس خاطر)

ہٹ کے بالین سے لوگ روتے ہیں
جیسے بیمار کو خبر نہ ہوئی

(کاروان عدم)

لٹ گیا سارا کاروان عدم
ایک کو ایک کی خبر نہ ہوئی
نیم جان چھوڑ کر چلا قاتل
نگہ یاس کارگر نہ ہوئی

(شمع کی اُداسی)

اداسی چھا گئی چہرے پہ شمع محفل کے
نسیم صبح سے شعلے بھڑک اُٹھے دل کے

(دل کا ولولہ)

شریک حال نہیں ہے کوئی تو کیا پروا
دلیل[1] راہ محبت ہیں ولولے دل کے

(دل کا فساد)

عجب نہیں کہ بپا ہو یہیں سے فتنۂ حشر
زمانے بھر میں ہیں سارے فساد اُسی دل کے

(عدم کا سفر)

نہ سنگ میل نہ نقش قدم نہ بانگ جرس
بھٹک نہ جائیں مسافر عدم کی منزل کے

(منزل کی خوشی)

خوشی کے مارے زمین پر قدم نہیں رکھتے
جب آئے قافلے والے قریب منزل کے

(نگاہ شوق)

نظارۂ رخ لیلےٰ مبارک اے مجنوں
نگاہِ شوق نے پردے اُٹھائے محمل کے

(ذوق جمال)

مشاہدے کو اک آئینۂ جمال دیا
کمال عشق نے جوہر دکھائے دل کے

[1] دلیل راہ بمعنی رہنما

زبان یاس سے افسانہ سحر سنئے
وہ رونا شمع کا پروانوں سے گلے مل کے

آغوش میں اب اُن کو کیا کھینچتی ہے دنیا
بیگانگی نے جن کو اپنا بنا لیا ہے

(دنیا سے بیگانگی)

منزل کی فکر کیوں ہو جب تو ہوا میں ہوں
پیچھے نہ پھر کے دیکھوں کعبہ بھی ہو تو کیا ہے

(منزل سے بے نیازی)

دست دعا سے اُٹھا پردہ جو درمیان تھا
اُٹھتی ہے آنکھ کیونکر اب یہ بھی دیکھنا ہے

(رفع حجاب)

غوّاص رمز فطرت ساحل کے پاس پہلے
غوطے لگا رہا تھا۔ اب غوطے کھا رہا ہے

(اسرار فطرت سے بیخبری)

ٹھوکریں کھلوائیں کیا کیا پائے بے زنجیر نے
گردش تقدیر نے جولانی تدبیر نے

(زنجیر سے بے نیازی)

آزادیٔ مطلق العنانی خود اپنے حق میں بلا ہوگئی۔ پائے بے زنجیر نے ایسی ایسی ٹھوکریں کھلوائیں کہ جولانیٔ تدبیر کی ساری حقیقت کھل گئی۔ غالب کی استادی کا شہرہ تو ہم نے بھی بہت سنا ہے۔ کیا عجب ہے کمال سخنوری کے ایسے نمونے اُن کے ہاں بھی موجود ہوں۔

(فیضِ ناکامی)

عالمِ اسباب سے کیا فیضِ ناکامی ملا
راہ پر لاکر مجھے بھٹکا دیا تقدیر نے

(سعیٔ لاحاصل)

کارواں کتنے بگولے بن کے غائب ہوگئے
خاک سے یکساں کیا جولانگہِ تدبیر نے

(خوابِ زندگی)

باز آئے زندگی کے خوابِ رنگا رنگ سے
دست و پا گم کر دیئے اندیشۂ تعبیر نے

(عاجزوں کی دادخواہی)

دادخواہی کو اٹھا ہی ذرّہ پامال تک
سوتے فتنوں کو جگایا حشرِ عالم گیر نے

(ماتمِ حسرت)

ماتمِ حسرت کیا پہلے گریباں پھاڑ کر
پھر دعا دی دشمنوں کو دستِ بے شمشیر نے

(اطاعت جبری)

جان دے کر ایک حکم آخری مانا تو کیا!
لکھ دیا جب سرکشوں میں کاتب تقدیر نے

اللہ اکبر کس قیامت کا درد بھر دیا ہے۔ کہتا ہے کہ تیرا آخری حکم جان بھی دے کر مانا تو کیا مانا وہ تو بہرحال ماننا ہی پڑتا یعنی جان بحق تسلیم ہونا ناگزیر تھا۔ اپنے شوق سے کوئی حکم بجالاتا تو شاید بندگی کا کچھ حق ادا ہو سکتا۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ کاتب تقدیر نے ازل ہی سے مجھے سرکشوں میں لکھ دیا تھا مصنف کے قلم سے جب یہ شعر نکلا ہے تو کئی دن تک کیفیت اضطراب طاری رہی۔

(تجسیم موہوم کا مضمون)

واہ کیا کہنا مجسّم کر دیا موہوم کو
نقشبندان ازل کی شوخی تحریر نے

(گرد فنا)

جم گئی گرد فنا ایسی کہ چھٹنے کی نہیں
کس غضب کا رنگ پکڑا یاس کی تصویر نے

(فتح حق) (مطلع)

سنگدل بھی یاد کرتے ہیں تہِ دل سے مجھے
فتح حق کی داد مل جاتی ہے باطل سے مجھے

یہ غزل مرزا صاحب نے میرٹھ کے جنرل مشاعرہ میں ارشاد فرمائی تھی۔ کوئی چھ سات ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔

آپ جس وقت پڑھنے کو کھڑے ہوئے حسن اتفاق سے ابر رحمت ایسا امنڈا کہ موسلا دھار برسنے لگا لوگ ٹھٹھ کے ٹھٹھ شامیانے کے نیچے بھیگ رہے تھے۔ مرزا صاحب پڑھ رہے تھے اور اک عالم محویت طاری تھا۔ مطلع میں غالبؔ حاسدین لکھنو کی طرف ارشاد ہے جو باوجود عداوت کے آپ کا لوہا مانتے ہیں۔

(ہمت عالی)

ہمت عالی سلامت ہے تو اندیشہ ہو کیا
پائے در زنجیر سے یا پائے در گل سہی مجھے

(قید خودی پر قید فرنگ)

بڑھ گئی قید خودی پر اور اک قید فرنگ
آزماتے ہیں وہ اب طوق و سلاسل سہی مجھے

(شاہد مقصود کی طلب)

ہے کوئی ایسا۔ ملا دے شاہد مقصود سے
یوسفِ گم گشتہ ویرانۂ دل سے مجھے

یوسف جو اسی ویرانۂ دل میں گم ہو گیا ہے کاش کوئی اُس سے ملا دیتا۔

(درس فنا)

لگ گئی لَو عالم بالا سے آنکھیں کھل گئیں
مل گیا درس فنا جب شمع محفل سے مجھے

(تقدیر پر تدبیر)

ناخدا اپنی سی کر گزرا مگر مجبور تھا
کھینچ لایا پھر دُرِ مقصود ساحل سے مجھے

(غفلت امروز)

خواب سے اندیشۂ فردا نے چونکایا تو کیا
غفلتِ امروز فرصت دیگی مشکل سے مجھے

(طنز و شماتت)

دوستی ہنستے ہیں ظالم پاشکستہ جان کر

خیر مقدم کی صدا دیتے ہیں منزل سے مجھے

لوگ مجھے شکستہ پا جان کر طنز کی راہ سے خیر مقدم کی صدا دیتے ہیں۔ اس سے اُن کا مقصد فقط دل دکھانا ہے۔

(دل ایذا طلب)

مانگنے دیتا نہیں پانی دل ایذا طلب

خون بہا کیا مانگنے دیگا یہ قاتل سے مجھے

حُسینی اخلاق کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ امام حسین نے کبھی اپنی پیاس بجھانے کو پانی نہ مانگا۔ بھلا ایسا دل ایذا طلب قاتل سے خون بہا کیا مانگے گا۔ اُس کی شان اخلاق کبھی اس مطالبہ کو پسند نہیں کر سکتی۔

(دولت بے طلب)

دردسر کی جستجو تھی درد دل حاصل ہوا

واہ کیا دولت ملی اس فکر باطل سے مجھے

(جلوہ بیرنگ)

جلوہ بیرنگ تھا پردے کے اندر کچھ نہ تھا

حق بجانب تھا جو اندیشہ تھا محمل سے مجھے

مجھے اپنی کوتاہ نظری کا اقرار ہے کہ میں دیوان غالب سے، جلوہ بیرنگ کا

جواب نہیں پیش کر سکتا۔ شاید کوئی اور صاحب پیش کر سکیں ہیں تو یہ جانتا ہوں کہ ان احساسات عالیہ کی ہوا بھی کسی کو نہ لگی ہو گی۔

دیدۂ دل بے نیاز جلوۂ امید ہے
یاس کیا دل بستگی اس نقش باطل سے مجھے

(دو [illegible])

مزہ گناہ کا جب تھا کہ باوضو کرتے
بتوں کو سجدہ بھی کرتے تو قبلہ رو کرتے

بہ یک کرشمہ دو کار اسے کہتے ہیں۔ یہ شوخی تخیل۔ کلام کا یہ تیکھا پن تقلیدی کوششوں سے ممکن نہیں تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔

(نخل آرزو یا آستین کا سانپ)

کبھی نہ پرورش نخل آرزو کرتے
نمو سے پہلے جو اندیشہ نمو کرتے

اس شعر کی لذت اُس غریب کے دل سے پوچھنا چاہیئے جو ناخلف اولاد کی پرورش میں لہو پانی ایک کرے اور پھر موت کا چلو ہاتھ آئے۔ وہ اولاد کس کام کی جو آگے بڑھ کر آستین کا سانپ نکلے۔

(نا اہلوں کو نصیحت)

سُنیں نہ دل سے تو پھر کیا پڑی تھی خار و نکو
کہ گل کو شرم انجام رنگ و بو کرتے

جو لوگ کسی غریب کی نصیحت دل سے نہیں سنتے ہنسی میں اُڑا دیتے ہیں پھر اُنہیں نصیحت کرنا فضول ہے۔

(گناہِ بے لذت)

گناہ تھا بھی تو کیسا گناہِ بے لذت
قفس میں بیٹھ کے کیا یادِ رنگ و بو کرتے؟

قفس میں یادِ رنگ و بو ماشاء اللہ رہیں جھوپڑے میں خواب دیکھیں محل کا اس خیالِ خام پر گناہ بے لذت کی پھبتی نے کیا مزہ دیا ہے۔

(موت کی مجبوری)

بہانہ چاہتی تھی موت بس نہ تھا اپنا
کہ میزبانیِ مہمان حیلہ جو کرتے

موت کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ بھی ضرور ہے۔ مگر افسوس انسان کتنا مجبور ہے کہ بہانہ بھی پیدا نہیں کرسکتا۔

(طلب صادق)

دلیل[1] راہ دلِ شب چراغ تھا تنہا
بلند و پست میں گزری ہے جستجو کرتے

دُلِ شب چراغ کی ترکیب وہ لعل شب چراغ ہے جس سے غالب کا خزانہ خالی ہے۔ طلب صادق کی کتنی صحیح تصویر کھینچی ہے۔

(کشش مرکزی)

ازل سے جوششِ مرکزی کے تھے پابند
ہوا کی طرح وہ کیا سیرِ چارسو کرتے

[1] دلیل راہ بمعنی رہنما

فلک نے بھول بھلیاں میں ڈال رکھا تھا
ہم اُن کو ڈھونڈھتے یا اپنی جستجو کرتے

عالم حیرت و گم گشتگی کی مجسم تصویر جو 'بھول بھلیاں' کے لفظ سے پیش نظر ہو جاتی ہے یہ کام مرزا یاس ہی کی قوت بیانیہ سے ممکن تھا غالبؔ 'بھول بھلیاں' کے لفظ سے ناآشنا نہ تھے مگر کیا حیرت و گم گشتگی کا مفہوم ادا کرنے کے لئے وہ یہ لفظ لا سکتے تھے؟

اسیر حال نہ مُردوں میں ہیں نہ زندوں میں
زبان کٹتی ہے آپس میں گفتگو کرتے

زبان کٹتی ہے آپس میں گفتگو کرتے۔ اس زور بیان کا کیا کہنا۔ ایک ایک شعر نئی وجدانی دنیا پیش کر دیتا ہے۔

پناہ ملتی نہ امیدِ بے وفا کو کہیں
ہوس نصیب اگر ترکِ آرزو کرتے

امید کو بے وفا کہنا خود اک کیفیت رکھتا ہے۔ مگر ہوس نصیبوں کے دل کو اس کی جائے پناہ قرار دینا قوت اجتہادی کی معراج ہے ہوس نصیب بھی اگر ترک آرزو پر آمادہ ہو جاتے تو پھر امید بے وفا کا ٹھکانا کہاں ہوتا۔ یہ ہیں سچے اور صحیح جذبات۔ یہاں دور از کار تخیل کا نام نہیں۔

(تصفیۂ قلب)

ازالہ دل کی نجاست کا اور کیا ہوتا؟
جلا کے خاک نہ کرتے تو کیا لہو کرتے

آگ سے زیادہ پاک کرنے والی کوئی شے اور کون سی ہو سکتی ہے خصوصاً عشق کی آگ جس سے بہتر تصفیہ قلب کا کوئی ذریعہ نہیں۔

مزارِ یاس پہ کرتے ہیں شکر کے سجدے
دعائے خیر تو کیا اہل لکھنؤ کرتے

اہل لکھنؤ کی ذہینت کا مرقع ہے۔ مرزا صاحب کے ساتھ اُنہیں جو بغض وحسد ہے اُس کا مقتضا اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ مرزا صاحب کے معاملہ میں اہل لکھنؤ کی ذہینت اور اُن کے احساسات کا مطالعہ کرو تو معلوم ہو کہ اس شعر کا ایک ایک لفظ صداقت سے لبریز ہے۔

(دورنگیِ لیل ونہار)

ہوش اُڑتے ہیں دورنگیِ لیل ونہار سے
فصل خزاں ہے دست وگریباں بہار سے

ہم دل جلوں کو راس نہ آئی ہوائے گل
اک آگ سی برستی ہے ابر بہار سے

آنکھ اپنی چرخ عربدہ جو سے لڑی رہی
اٹکا نہ دل زمانۂ بے اعتبار سے

(جان بے قرار)

بانگ جرس سے کیا عجب آگے نکل چلے
باہر ہے اپنی جانِ حزیں اختیار سے

جانِ حزیں شوقِ منزل میں اس قدر آپے سے باہر ہے کہ عجب نہیں آواز جرس سے بھی آگے نکل چلے۔

(تصورِ نگاہ)

تابِ نگاہ کی نہیں آنکھوں سے چشمداشت
کیا لو لگائیں وعدۂ دیدارِ یار سے

غالب نے بھی اس مفہوم کو کئی طرح نظم کیا ہے مگر یہ الفاظ کسے نصیب ہوتے ہیں۔ آنکھوں سے تابِ نگاہ کی چشمداشت نہیں۔ اس لطافت کا کیا کہنا اور پھر 'لو لگانے' کی فصاحت و بلاغت سبحان اللہ۔

(موت کی یاد میں محویت)

آنکھوں کو بند کرکے تصور میں موت کے
پائی نجات کشمکشِ روزگار سے

(زمانے کی آزادی)

یاسؔ اب ذلیل ہی کو سمجھتے ہیں سب عزیز
کانٹے چمن کے تلتے ہیں پھولوں کے ہار سے

(نگاہِ شوق)

(خاموشی)

نگاہِ شوق ہوتی یا نگاہِ واپسیں ہوتی
بہرصورت زبانِ گنگ معنی آفریں ہوتی

(امید وبیم)

امید و بیم روز افزوں، بالِ جانِ و دل ٹھہری
فنا کے بعد بھی تا حشر یکسوئی نہیں ہوتی

(سفر بے طلب)

نہیں سُنتا کسی کی پائے نافرمان نہیں سنتا
سفر کیا اُس مسافر کا طلب جس کی نہیں ہوتی

(محرومی)

وہ محروم ازل ہیں دھیان میں لاتا نہیں کوئی
محبت کیا ہم ایسوں سے عداوت تک نہیں ہوتی

(قیامتخانہ دل)

قیامتخانہ دل جنت صبر و سکون ہوتا
محیط چرخ کے باہر اگر یہ سرزمین ہوتی

(محدودی)

نگاہ مضطرب کی حد ہے فانوسِ خیالی تک
قیامت تھی اگر پروانۂ شمع یقیں ہوتی

(محرومی و ناکامی)

ازل سے کشتی امید تھی بیگانہ ساحل
جہاں پایاب ہی دریا وہاں بھی تہ نشیں ہوتی

(شقاوت نفس)

یہ آب آتشیں ہے، اور یہ دریا خون ناحق کا
مگر نفس شقی کی پیاس میں تسکین نہیں ہوتی

(حق پسندی در ایذا طلبی)

غضب ہے مُنہ چھپانا سجدۂ ناحق کی پردے میں
بلا سے تختۂ مشق ستم لوحِ جبیں ہوتی

فقط دل کی بدولت گرم ہے پہلوی جان ورنہ
جسد میں روح اک دیوانۂ تنہا نشین ہوتی

خزاں سے پہلے ہی کاش اپنی آنکھیں بند ہو جائیں
بہارِ اولیں ہوتی نگاہِ واپسیں ہوتی

جو رو سکتے تو آنسو پونچھنے والے بھی مل جاتے
شریکِ رنج و غم دامن سے پہلے آستین ہوتی

دمِ آخر فریبِ جلوۂ بیرنگ نے مارا
نگاہِ یاس ورنہ کیوں گنہگارِ یقیں ہوتی

(اضطرابِ شوق)

اضطرابِ بال و پر پروانہ وارم دادہ اند
جائے دل یک شعلۂ بے اختیارم دادہ اند

(اسیر بلوچ)

(ترتیب نظم)

تشنۂ موجِ سرابم پا بجولان مے روم
منزلِ موہوم و پائے بے قرارم دادہ اند

(ترتیب منزل)

مے دہد ہر منزلِ نو شوقِ پروازِ دگر
در پئے عنقا فریبِ خوشگوارم دادہ اند

(گوش نامحرم)

گوشِ نامحرم نیرزد جز صدائے بازگشت
صد جوابِ التجا بیگانہ وارم دادہ اند

(لغزش بے اختیار)

از فضائے عالمِ بالا فتادم سرنگون
سوئے پستی لغزشِ بے اختیارم دادہ اند

(خویش تماشا)

خویش را بہر تماشا درمیان دزدیدہ ام
جائے خوش در پہلوئے گل ہمچو خارم دادہ اند

(پیام زیرلب)

مژدۂ تسکین یگانہ کے نصیبِ من شود
یک پیامِ زیرِ لب بیگانہ وارم دادہ اند

دل اگر گردشِ تقدیر سے دریا نہ بنے
تشنہ کاموں کے لئے کاشکے پیمانہ بنے

دل وُہی دل ہے جو ہو اپنی حرارت سے فنا
خاک ہو جائے مگر آگ بگولا نہ بنے

بجھ گیا دل کا کنول کشمکشِ شوق کجا
شمعِ خاموش کا کیونکر کوئی پروانہ بنے

زندہ در گور گیا اس دلِ وارفتہ نے
جیتے جی کوچہ و بازار میں افسانہ بنے

کیوں اجل ہی کوئی ایسا جو مرا مُنہ سی دے
بات اپنی نہیں بننے کی تو اچھا نہ بنے

آپ آتے تھے مگر موت کو پہلے بھیجا
چال ایسی تو چلے کوئی کہ جھوٹا نہ بنے

رات دن شوق رہائی میں کوئی سر ٹپکے
کوئی زنجیر کی جھنکار سے دیوانہ بنے

قیمت دل تو ہے معلوم مگر کیا کہئے
مول جب تک نہ کرے کوئی تو سودا نہ بنے

دل آگاہ پہ جادو نہ چلے گا کوئی
ہاں مگر مصلحت وقت سے دیوانہ بنے

اُتری جاتی ہے مرے دل میں صدائے ناقوس
اب خدا چاہے تو کعبہ بھی صنمخانہ بنے

کہئے کعبہ کو سدھارے کہ صنمخانے کو
دیکھا دیکھی جو کوئی آپ کا دیوانہ بنے

وحشت آبادِ عدم ہے وہ دیار خاموش
کہ قدم رکھتے ہی ایک ایک سے بیگانہ بنے

محو فطرت ہو کوئی دل تو کہیں کا نہ رہے
عین حکمت ہی اگر آپ سے بیگانہ بنے

نام لے کر ترا بہزاد اُٹھاتا ہے قلم
نقش موہوم مگر ٹھیک بنے یا نہ بنے

نگہ یاس ارے توبہ جدھر اُٹھ جائے
دل تو کیا عالم ایجاد بھی ویرانہ بنے

نہ چھپایا پر نہ چھپا جوہر عالی ظرفی
یاس مٹنے پہ بھی خاک در میخانہ بنے

ہمہ تن شمع بنے یا ہمہ تن دل ہو جائے
جل کے ٹھنڈا کہیں پروانۂ محفل ہو جائے

اس میں شک نہیں کہ غالب فن شاعری کا پیغمبر تھا۔ قدرت کی طرف سے اُسے فلسفیانہ دماغ تو ملا مگر شاعر کی زبان نہ ملی۔ دیکھو اس صدی کا سخنور یگانہ فلسفۂ عشق کو کس آسمانی زبان میں ادا کرتا ہے۔ سوز و ساز عشق جب مرتبہ کمال کو پہنچ جاتا ہے تو روح کو سرور ابدی حاصل ہوتا ہے اس مفہوم کو یوں ادا کیا ہے کہ عشق میں کامل ہونا چاہتے ہو تو ہمہ تن شمع یا ہمہ تن دل بن جاؤ جب تک جل کے ٹھنڈے نہ ہو جاؤ گے کمال عشق کو نہ پہنچو گے۔

حُسنِ بیرنگ کہیں رنگ پکڑ سکتا ہے
پردہ جبتک نہ کوئی بیچ میں حائل ہو جائے

حُسن ازل کو حسن بیرنگ سے تعبیر کرنا دنیائے شاعری کا معجزہ ہے جس کا ظہور مطلق محالات میں سے ہے جب تک کوئی پردہ درمیان میں نہ ہو صورت یا رنگ نہیں پکڑ سکتا۔ کبھی کبھی یہ حسن مطلق جامہ بشریت میں بھی ظہور کرتا ہے۔ یہ معنی ہیں اوتار یا وجہ اللہ کے۔ ہندوؤں میں سری کرشن جی اور مسلمانوں میں علی

مرتضیٰ وجہہ اللہ کی ذات میں اس حسن نے اپنا جلوہ دکھایا۔ کرشن جی کو لوگ بھگوان سمجھنے لگے اور علی مرتضیٰ کو نصیری خدا کہنے لگے۔

حسن وہ حسن کبھی جس کی حقیقت نہ کھلے
رنگ وہ رنگ جو ہر رنگ میں شامل ہو جائے

'ہمہ اوست' کی فلاسفی کو اتنے سادہ اور برجستہ انداز سے بیان فرما دیا جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔ یہی وہ سہل ممتنع ہے جس پر قابو پانا کمال سخنوری کی آخری حد ہے۔

(مطلب نایاب کی تمنا)
دل ملا۔ درد ملا۔ درد کا مطلب نہ ملا
کاش وہ مطلبِ نایاب بھی حاصل ہو جائے

(ارادہ و عمل)
پائے خودسر تو ارادہ سے عمل تک پہنچا
کیا غضب ہو کوئی دیوار جو حائل ہو جائے

(فلسفۂ جبر وقدر)
خاک کا پتلا ہے رفتارِ نمو سے مجبور
ہمہ تن سنگ بنے یا ہمہ تن دل ہو جائے

اللہ اللہ انسان کتنا مجبور ہے۔ اُسے اپنی رفتار نمو اپنی نشو و نما پر بھی کوئی اختیار نہیں۔ نیک بننا چاہے یا بد اُس کے بس کی بات نہیں کیونکہ اُسکی ساری نشو و نما ماحول کی تابع ہے۔ ماحول چاہے اُسے پتھر سے زیادہ سخت یا موم سے زیادہ نرم بنا دے۔ اُس کا ارادہ اُس کی آرزو کوئی کام نہیں دیتی۔ دیکھو فلسفیانہ مضامین

میں بھی یوں درد پیدا کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ شاعرانہ زبان میسر آئے۔

(قصور و جرم و عفو)

صلح جوئی نے گنہگار مجھے ٹھہرایا
جرم ثابت جو کیا چاہو تو مشکل ہو جائے

میرا جرم ثابت کر دینا نہایت مشکل ہے۔ کیونکہ فطرت مجبور کو اعمال نیک و بد پر کوئی اختیار نہیں۔ حقیقت حال تو یہ ہے مگر میں نے اپنی صلح جوئی سے اقرار جرم کرنا گوارا کر لیا مجھے حجت و تکرار منظور نہیں ہیں یہ سوء ادب روا نہیں رکھتا کہ تجھ سے اپنے گناہوں کا ثبوت مانگوں کیونکہ جانتا ہوں تو میرا گناہ ثابت نہیں کر سکتا۔

بھولنا سہل گناہوں کا بھلانا مشکل
تو جو یاد آئے تو آسان یہ مشکل ہو جائے

بھولنا تو سہل ہے مگر بھلا دینا مشکل ہے۔ کیا کہنا اس حقیقت کا میں اپنے گناہوں کو بھلا دینے کی جتنی کوشش کروں گا وہ اور یاد آتے جائیں گے۔ ہاں بس ایک صورت ہے وہ یہ ہے کہ اگر تیری یاد میرے دل میں گھر کر لے تو پھر میں اپنے گناہوں کو کیا خود اپنے تئیں بھول جاؤں گا۔

(عدل و احسان)

حق میں اوروں کے تری ذات سراپا احسان
وائے قسمت کہ مری ضد سے تو عادل ہو جائے

اس کیفیت درد کو کوئی اس سے بہتر کیا بیان کر سکتا ہے۔ صفات الٰہیہ میں سے

عدل اک بڑی صفت ہے مگر منطق کی یہ شوخی بھی قابل دید ہے کہ احسان کے مقابلہ میں لاکر عدل کو کتنا گھٹا دیا ہے۔ کہتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ تو تیری ذات سراپا احسان ہے اوروں سے بھی لاکھوں گناہ سرزد ہوئے مگر تو نے اُن پر تو فضل و احسان کیا مگر وائے برحال میرے کہ تو نے میرے ہی ساتھ عدل کا برتاؤ کیا۔ جو کچھ کیا وہ ٹھیک کیا کوئی شکایت نہیں شکایت بس یہی ہے کہ مجھے اپنے احسان سے محروم رکھا۔

(درد خداداد)

کون ٹھہرائے پھر اس کشتی بے لنگر کو
دل اگر درد خداداد کی منزل ہو جائے

خارجی درد تو عارضی ہوتا ہے ابھی ہے تھوڑی دیر کے بعد جا سکتا ہے مگر جو درد خداداد ہو وہ کیونکر جائے۔ ایسے دل کی مثال کشتی بے لنگر کی ہے جسے کوئی ٹھہرا ہی نہیں سکتا۔

(فلسفۂ مذہب)

ناخدا کو نہیں ابتک تہِ دریا کی خبر
ڈوب کر دیکھے تو بیگانہ ساحل ہو جائے

"ڈوب کر دیکھنے" کی بلاغت تو دیکھئے۔ شعر دیکھنے میں کتنا آسان ہے مگر اس سہل ممتنع کا جواب ہی نہیں ہو سکتا۔ مذہب کے فلسفہ کو اس قادر الکلامی سے آج تک کسی نے بیان نہیں کیا۔ مذہبی مُلّا جو حقیقت مذہب سے بے خبر ہو کر رسمیات مذہب کو عین مذہب سمجھنے لگے ہیں وہ ذرا ڈوب کر دیکھیں تو معلوم ہو کہ وہ کتنے

بے خبر ہیں۔ کاش غالب کا دیوان ایسے حقائق پیش کر سکتا۔

(محویتِ سجدہ)

ایک ہی سجدہ کیا دوسرے کا ہوش کجا
ایسے سجدے کا یہ انجام کہ باطل ہو جائے

رسمیات کے پابند تو بیدھڑک یہ کہہ دیں گے کہ فقط ایک سجدہ سے نماز پوری نہیں ہو سکتی سجدہ باطل ہو گیا۔ مگر جسے ایک سجدہ کے بعد سر اُٹھانے کا ہوش ہی نہ رہے کیوں کر کہوں کہ بارگاہ احدیت میں ایسا سجدۂ شوق باطل سمجھ لیا جائے گا۔

(مشیت ایزدی)

اپنی ضد اپنی مشیت پہ جو آ جائے کوئی
پاس سب حسنِ عمل دفتر باطل ہو جائے

مشیت کہو یا ضد کہو ایک ہی بات ہے۔ حسن عمل پر بھروسا کرنا غلط ہے۔ مالک کی جیسی مرضی قبول کرے یا نہ کرے۔

(خامۂ تقدیر کی خامی)

کھل گئے عیب و ہنر سب کاتب تقدیر کے
رنگ ہیں آمادۂ پرواز ہر تصویر کے

پہلا مصرع سُن کر کان کھڑے ہوتے ہیں کہ کاتب تقدیر کے ہنر میں تو کوئی شک نہیں مگر عیب کیسا۔ دوسرا مصرع سنتے ہی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ شاعر کے قلم نے کتنی گہری حقیقت کی طرف رہنمائی کر کے خامہ تقدیر میں عیب نکالا ہے۔ خامہ تقدیر کی ہر صنعت آپ اپنی مثال ہے۔ مگر کوئی تصویر ایسی نہیں کھچی جس کے

رنگ و روغن کو ثبات و قیام ہو۔ ہر تصویر کا رنگ آمادۂ پرواز ہے اس سے بڑھ کر عیب کا ثبوت اور کیا ہوگا۔

(خواب بے تعبیر)

وہم باطل ہے سراسر صوت آباد جہان
راز کھل سکتے نہیں اس خوابِ بے تعبیر کے
کوئی تصویر خزاں ہو کوئی تصویر بہار
دیدنی ہیں کارنامے خامۂ تقدیر کے

(حسن مشت خاک)

کارخانہ تھا ہوا پر حسنِ مشتِ خاک کا
کھل گئے آخر فریب اس بولتی تصویر کے

(عقل و عشق)

کوئی بندہ عقل کا ہے کوئی بندہ عشق کا
پاؤں اپنے ہی نہ تھے قابل کسی زنجیر کے

(شوق منزل)

شوق منزل میں زمین پر پاؤں تک پڑتے نہیں
حوصلے پھر کیا بڑھیں گے خار دامن گیر کے

(فلسفۂ شجاعت)

خاک میں مل جائیگی سب عزت مردانگی
ظلم کے ہاتھوں اگر جوہر کھلے شمشیر کے

یاس سر سے پاؤں تک امید ہی امید تھے
فرد جب تک ہاتھ میں تھی کاتب تقدیر کے

نہ انتقام کی عادت نہ دل دکھانے کی
بدی بھی کر نہیں آتی مجھے کجانیکی

دہائی ہے دلِ درد آشنا دہائی ہے!
کہ آہ سرد پہ تہمت ہی دل دکھانے کی

دل درد آشنا میرے درد کی داد دینے والا تیرے سوا کون ہے میں شدت درد سے مجبور ہو کر آہ سرد بھرتا ہوں تو لوگ مجھ پر دل دکھانے کا الزام رکھتے ہیں میری آہوں سے لوگوں کا دل دکھتا ہے وہ اس کے بھی روادار نہیں کہ میں آہ کر سکوں۔

سمجھ میں آئی نہ زندان شش جہت کی کشش
کہ پاؤں رکھنے کی جا ہے نہ بھاگ جانیکی

(زندان شش جہت)

حقیقت معنوی کا طلسم ہے۔ زندان شش جہت کی کشش کا کیا ٹھکانا ہے۔ ہر جہت اپنی اپنی طرف کھینچ رہا ہے میں معلق لٹکا ہوں نہ اِدھر ہو سکتا ہوں نہ اُدھر نہ زمین پر پاؤں رکھ سکتا ہوں نہ اس قید خانے سے نکل جانے کی تاب رکھتا ہوں۔

(رفتار زمانہ)

ہوا کے ساتھ پھرے چار سمت آوارہ
قدم اُٹھائے جو رفتار پر زمانے کی

زمانے کی رفتار بے ڈھنگی ہے۔ آج کچھ ہے کل کچھ ہے۔ اس کی رفتار پر جس نے قدم مارا اُس کا کوئی مستقل مرکز نہیں ہو سکتا۔ چوبائی کی طرح چاروں طرف مارا پھرے گا۔

(فریب سے آگاہی)

فریب بانگ جرس کیا عجب کنوئیں میں گرائے
صلاح ٹھہری ہو اب دل سے بیٹھ جانے کی

(زندہ دلی)

ہر ایک ذرّہ سے آتی ہے بوئے زندہ دلی
نہ جانے خاک ہے اپنی کس آستانے کی

(وعدہ فردا کا یقین)

یقین وعدۂ فردا سے دل ہے مالا مال
نظر میں دولت دنیا نہیں سمانے کی

([illegible])

نہ جانے کون ہے وحدت سرائے دل میں اسیر
کہ ہم کو بھی اجازت نہیں ہے آنے کی

(آشیان و قفس کی حقیقت)

ہوا کا دخل نہیں یاں۔ وہاں ہوا کا عمل
قفس کی سُست بنا ہے کہ آشیانے کی؟

بنا تو آشیانے ہی کی سُست ٹھہری جہاں ہر وقت ہوا کا عمل ہے۔ ایک جھونکا آیا اور اُڑا لے گیا۔ قفس کی بنا پھر بھی مستحکم ہے جہاں باد مخالف کا گزر نہیں۔

(روحِ رواں)

پلٹ کے گل میں نہ آئیگی بوئے مستانہ
نکل کے روحِ رواں منہ نہیں دکھانے کی

(ختمِ سفر)

اب اپنے ختمِ سفر میں کچھ ایسی دیر نہیں
جو دیر ہے تو فقط تھک کے بیٹھ جانے کی

(بازگشتِ وطن)

اُدھر اجل نے دیا حکم بازگشتِ وطن
اِدھر حیا نے قسم دی قدم اُٹھانے کی

اُف ری کشمکش۔ موت کا حکم ہے کہ تجھے وطن میں جا کر مرنا پڑے گا۔ اِدھر حیا اجازت نہیں دیتی کہ وطن کی طرف قدم اُٹھاؤں۔ اہلِ وطن کو کیا مُنہ دکھاؤں۔

(ڈوبتے کو بچانا)

جو ڈوبتے کو بچائے وہ آپ بھی ڈوبے
عوض ہے دونوں کا یکساں بدی ہو یا نیکی

(قسمت آزمائی کی ہوس)

ہوس ہے سلسلہ جنبانِ سعیِ لاحاصل
بھری ہے سر میں ہوا قسمت آزمانے کی

زبانِ یاس سے آمین تک نہیں نکلی
دعائے خیر تو کرنے کو نا خدا نے کی

(ماسٹر بیبیں)

ہے جان کے ساتھ اور اک ایمان کا ڈر بھی
وہ شوخ کہیں دیکھ نہ لے مڑ کے اِدھر بھی

وہ ہم سے نہیں ملتے ہم اُن سے نہیں ملتے
اک ناز دل آویز اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

اللہ ری بیتابی دل وصل کی شب کو
کچھ کشمکش شوق بھی کچھ صبح کا ڈر بھی

انگڑائیاں لے لیکے اُٹھے صاحب محفل
کچھ نیند بھی آنکھوں میں ہے کچھ مے کا اثر بھی

(آغاز و انجام)

وہ کشمکشِ غم ہے کہ میں کہہ نہیں سکتا
آغاز کا افسوس اور انجام کا ڈر بھی

(گردش ایام)

کھول آنکھیں ذرا مست ہے کیا ساغر جم سے
ہے گردش ایام کی کچھ تجھ کو خبر بھی

(جاتی ہوئی دنیا)

دیکھے کوئی جاتی ہوئی دُنیا کا تماشا
بیمار بھی سر دھنتا ہے اور شمع سحر بھی

(زندگی کا کیا بھروسا)

بجھتی ہوئی اک شمع ہوں کیا دم کا بھروسا
دشمن ہے مری جان کی اب آہِ سحر بھی

(شامِ مصیبت کی آمد)

کس شان سے آتی ہے مری شام مصیبت
وہ دیکھو جلَو میں ہے قیامت کی سحر بھی

(سوزِ غربت و حبِ وطن)

صحرا کی ہوا کھینچے لئے جاتی ہے مجھ کو
کہتا ہے وطن دیکھ ذرا پھر کے اِدھر بھی

(بیڑی کی کٹ گئی)

ہاں کٹ گئی شاید ترے دیوانے کی بیڑی
پچھلے پہر آئی تھی کچھ آواز ادھر بھی

(وعدۂ دیدار کی حقیقت)

کیا وعدۂ دیدار کو سچ جانتے ہو یاسؔ
لو فرض کرو آئی قیامت کی سحر بھی

(جلوۂ موہوم)

دل عجب جلوۂ موہوم دکھاتا ہے مجھے
شام سے یاس سویرا نظر آتا ہے مجھے

(دار و رسن)

جلوۂ دار و رسن کوئی دکھاتا ہے مجھے
کس و ناکس کی نگاہوں پہ چڑھاتا ہی مجھے

(شوقِ ایذا طلبی)

دل کو لہراتا ہے ہنگامۂ زندانِ بلا
شورِ ایذا طلبی وجد میں لاتا ہے مجھے

پائے آزاد ہے زنداں کے چلن سے باہر
بیڑیاں کیوں کوئی دیوانہ پنہاتا ہے مجھے

ہنس کے کہتا ہی کہ گھر اپنا قفس کو سمجھو
سبق الٹا مرا صیاد پڑھاتا ہے مجھے

جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے
کس قدر واعظِ مکّار ڈراتا ہے مجھے

پھٹ پڑیں اب بھی در و بام تو پردہ رہ جائے
فلکِ خانہ خراب آنکھ دکھاتا ہے مجھے

دیدنی ہے چمن آرائیِ چشمِ عبرت
سیرِ تازہ گلِ پژمردہ دکھاتا ہے مجھے

ترکِ مطلب سے ہے مطلب تو دعائیں کیسی؟
صبح تک کیوں دلِ ہمسایہ جگاتا ہے مجھے

(ترکِ مطلب)

ننگِ محفل مرا زندہ مرا مردہ بھاری
کون اُٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے

دوسرا مصرع کتنا ٹیڑھا تھا مگر مصرع لگاکر شعر کو آسمان پر پہنچا دیا ہے: "ننگ محفل مرا زندہ" مرا زندہ" کہنا یاس ہی سے ممکن ہے۔ غالب نے بھی کہنے کو کہا ہے ؎
زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے   دیکھئے مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے
مگر مرزا یاس نے اس شعر میں "ننگ محفل" کی ایسی صورتگری کی ہے کہ جواب نہیں ہو سکتا۔

لبِ دریا کا ہوا ہیں نہ تہِ دریا کا
ناخدا کون سے گھاٹ اب لئے جاتا ہی مجھے

یاس منزل ہی مری منزلِ عنقائے کمال
لکھنؤ میں کوئی کیوں ڈھونڈھنے آتا ہی مجھے

مقطع میں حاسدین لکھنؤ کی اس حرکت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب باہر کے لوگ لکھنؤ آکر مرزا صاحب سے ملنا چاہتے اور شعرائے لکھنؤ سے مرزا صاحب کا پتا پوچھتے تھے تو وہ دانستہ لوگوں کو بہکا دیتے تھے۔ کہہ دیتے تھے کہ یاس صاحب نے لکھنؤ چھوڑ دیا نہ معلوم کہاں چلے گئے حالانکہ اس زمانے تک مرزا صاحب نے لکھنؤ چھوڑا نہ تھا۔ کوئی یہ کہتا تھا کہ اجی حضرت آپ بھی کس شخص سے ملنا چاہتے ہیں یاس بھی کوئی آدمی ہے؟ اسی واقعہ کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے کہ لوگ مجھے لکھنؤ میں کیوں ڈھونڈھتے ہیں۔ میں لکھنؤ میں ہوں تو سہی مگر میری منزل منزل عنقائے کمال ہے جس کا پتا کسی کو نہیں مل سکتا۔ غالب کی غزل بھی اس زمین میں موجود ہے مقابلہ کرکے دیکھ لو۔

(حضرت جان)

ازل سے سخت جان آمادۂ صد امتحاں آئے
عذابِ چند روزہ یا عذابِ جاوداں آئے

ایذا طلبی و سخت جانی کی حد ملاحظہ ہو۔ کیا غالب کا دیوان عذاب چند روزہ و عذاب جاوداں کی مثال پیش کر سکتا ہے۔

(حضرت [illegible])

کنول روشن تو ہو دل کا پیامِ ناگہاں آئے
بلا سے شامتِ پروانۂ آتش بجاں آئے

اگرچہ شمع کی روشنی پروانوں کے لئے موت کا پیام ناگہاں ہے مگر بلا سے کچھ بھی

ہو دل کا کنول اسی روشنی سے کھلتا ہے - جذبۂ عشق کی کیا روشن تصویر ہے -

قفس بر دوش پھرتے ہیں خزاں آبادِ عالم میں
اسیرانِ ازل گھر چھوڑ جنگل میں کہاں آئے

(بہارستانِ عبرت)
بہارستانِ عبرت میں یہ گل کیا - خار کیا - خس کیا
سراپا سب کے سب آلودۂ رنگِ خزاں آئے

(بے کسی)
سواری بولنے والا نہ کوئی نوحہ خواں اپنا
اجل کیا آئی جیسے بے بلایا میہمان آئے

(رازِ فردا)
خیالِ خام ہے یا معنیِ موہوم کیا جانیں
سمجھ میں رازِ فردا کیوں نصیبِ دشمناں آئے

(احسانِ بے حاصل)
نرا ہے احسانِ بے حاصل کہ دن کے دن اسیروں کو
اجل کے ساتھ حکمِ بازگشتِ آشیاں آئے

خدا کی پناہ کیا دردانگیز سین ہے بازگشت آشیان کا حکم ملا تو کب بس دن کے دن - حکم رہائی اور موت کی آمد کا ایک ہی وقت مقرر ہوا - بھلا اس احسان بے حاصل کی کیا ضرورت تھی - مفت کرم داشتن اسی کو کہتے ہیں -

(فنا کی کشش)
وہی آغوشِ ساحل اور وہی منجدھار کے ڈوبے
پلٹ کر خاک میں ملنے کہاں سے پھر کہاں آئے

(نگاہ یاس)

حق[1] اپنی دھن کا پکّا باطل اپنے زعم میں پورا
الٰہی گفتگوئے صلح کیوں کر درمیان آئے

سکونِ بیدلی میں کیا کہوں کیوں لہر پیدا ہے
مبادا غیب سے کوئی نویدِ ناگہاں آئے

حریم ناز کیا ہے جلوہ گاہِ بے تماشا ہے
نگاہ یاس کہتی ہے کدھر آئے کہاں آئے

(بخت بیدار)

بخت بیدار اگر سلسلہ جنباں ہو جائے
شام سے بڑھکے سحر دست و گریباں ہو جائے

پڑھکے دو کلمے اگر کوئی مسلماں ہو جائے
پھر تو حیوان بھی دو روز میں انساں ہو جائے

آگ میں ہو جسے جلنا تو وہ ہندو بن جائے
خاک میں ہو جسے ملنا وہ مسلماں ہو جائے

دشمن و دوست سے آباد ہیں دونوں پہلو
نام جانے کا نہ لے جو مرا مہماں ہو جائے

---

[1] یہ شعر مصنف اور حاسدین لکھنؤ کے کیرکٹر کا آئینہ ہے۔

درد کا قحط ہو دل کا کوئی گاہک نہ رہے
وائے بر عشق کہ بازیچۂ طفلان ہو جائے

روگ ایسا لگے پھر جس کی دوا ہو نہ دعا
درد سے پہلے جو دل خوگرِ درمان ہو جائے

درد سے پہلے ہی دوا کرنے کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ مرض نہ ہوتا بھی ہو تو ہو جائے اور ایسا روگ لگے کہ پھر جس کی دوا ہو نہ دعا۔

خوابِ شیریں نہ سہی خوابِ پریشان ہی سہی
دل بہلنے کا شبِ غم کوئی سامان ہو جائے

پاؤں پھیلاتے ہیں رہ رہ کے اسیرانِ ہوس
چاہتے ہیں قفسِ تنگ گلستان ہو جائے

دل کو کچھ زندگیِ عشق کی لذت تو ملے
خاک سے پاک ہو یا خاک سے یکساں ہو جائے

موت کی یاد میں نیند اور بھی اُڑ جاتی ہے
نیند آ جائے تو کچھ موت کا سامان ہو جائے

(آغاز خطرناک)

اُف رے آغاز خطرناک کہ رکھتے ہی قدم

منزل دیر و حرم بھول بھلیاں ہو جائے

(حسن پشیمان)

نشۂ حسن کو اس طرح اُترتے دیکھا

عیب پر اپنے کوئی جیسے پشیمان ہو جائے

(بیداری موہوم)

یاس بیداری موہوم ہے ساری ہستی

آنکھ ہو بند تو سب خواب پریشان ہو جائے

زمانہ پر نہ سہی دل پہ اختیار رہے

دکھا وہ زور کہ دنیا میں یادگار رہے

زمانہ پر قابو پانا تو مشکل ہے مگر ہاں اپنے دل پہ قابو حاصل کر لو تو یہ بھی بڑی بات ہے۔

(زبان حال)

کہاں تلک دل غمناک پردہ دار رہے

زبان حال پہ جب کچھ نہ اختیار رہے

دل غمناک اپنی حالت زار کہاں تک چھپا سکتا ہے۔ زبان حال خود پکار اُٹھے گی۔

نظام دہر نے کیا کیا نہ کروٹیں بدلیں
مگر ہم ایک ہی پہلو سے بے قرار رہے

ضبط و اضطراب کی کشمکش اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی۔ زمانے نے کیا کیا کروٹیں بدلیں کیا کیا مصیبتیں ڈالیں میں شدت درد سے بیقرار تو رہا مگر کروٹ نہ بدلی۔ اگر دیوان غالب میں بھی ایسی درد انگیز تصویریں موجود ہیں تو کیا کہنا۔ اس شعر پر مصنف خدائے سخن ہونے کا دعویٰ کرے تو خدا گواہ ہے حق بجانب ہو گا۔

زمانہ سازوں کا مرکز نہ دائرہ کوئی
ہوا میں جیسے بگولا خراب و خوار رہے
اُبھارتی ہے ہوس توبہ ریائی کی
کہ دل کیساتھ زبان کیوں گناہگار رہے

ریاکاری کا تقاضا یہ ہے کہ دل اگر صدق نیت سے توبہ کرنا نہیں چاہتا تو اُس کے ساتھ زبان کیوں گناہگار رہنا گوارا کرے۔ زبان کو چاہئے کہ جھوٹ موٹ ہی سہی توبہ کرے۔

ہنسی میں لغزش مستانہ اُڑ گئی واعظ
تو بے گناہوں سے اچھے گناہگار رہے

اس شوخی کلام کا کیا کہنا۔

جواب دے کے نہ توڑو کسی غریب کا دل
بلا سے کوئی سراپا امیدوار رہے

سزائے عشق بقدرِ گناہ ناممکن
یہی بہت ہے کہ برہم مزاجِ یار رہے

دکھاؤں چیر کے دل دردِ دل کہوں کبتک
زباں پہ کیوں یہ تقاضائے ناگوار رہے

تڑپ تڑپ کے اُٹھاؤنگا زندگی کے مزے
خدا نکردہ مجھے دل پہ اختیار رہے

زمانہ اس کے سوا اور کیا وفا کرتا
چمن اُجڑ گیا کانٹے گلے کے ہار رہے

[illegible]

زمانے کی وفا کو کس انوکھے انداز سے بیان کیا ہے چمن کو تو تاراج کر ڈالا
مگر کانٹوں کو میرے گلے کا ہار بنا دیا۔ کیا کہنا اس وفا کا۔ جب وفا یہ ہے تو جفا کیا
ہوگی۔ اس کے مقابلہ میں ٹگور کے گلہائے خزاں دیدہ پر بھی اک نظر کرنا چاہئے
کہتا ہے:-

The spring has done its flowering
and taken leave. And with the

burden of faded flowers, I wait & linger.

(خزاں نے جھگڑا چکا دیا)

خزاں کے دم سے مٹا خوب و زشت کا جھگڑا
چلو یہ خوب ہوا گل رہے نہ خار رہے

(نشہ خودی)

مزہ تو جب ہے یگانہ کہ یہ دل خود بین
خودی کے نشہ میں بیگانہ خمار رہے

(درد خداداد)

جب تک خلش درد خداداد رہے گی
دنیا دل ناشاد کی آباد رہے گی

دنیا کی ہوا راس نہ آئے گی کسی کو
ہر سر میں ہوائے عدم آباد رہے گی

چونکاتے گی رہ رہ کے تو غفلت کا مزہ کیا
ساتھ اپنے اجل صورت ہمزاد رہے گی

(روح مجرد)

روح اپنی ہے بیگانہ ہر جنت و دوزخ
گم ہو کے ہر اک قید سے آزاد رہے گی

روح جب قالب عنصری آزاد ہو گئی تو پھر اُس کے لئے کوئی قید مکانی کیسی؟

جنت ہو یا دوزخ روحِ مجرد محدود نہیں ہو سکتی۔

(ادبگاہِ قفس)

دل اور دھڑکتا ہے ادبگاہِ قفس میں

شاید یہ زبانِ تشنہ فریاد رہے گی

کیا ادبگاہِ قفس کی بلاغت کا جواب ہو سکتا ہے۔ قفس میں صیاد کے پاسِ ادب سے دل اور دھڑکتا ہے۔ نالہ و فریاد کا خیال خام تھا۔ یہاں زبان کھولنے کی مجال نہیں۔

([illegible])

جو خاک کا پتلا وہی صحرا کا بگولا

مٹنے پہ بھی اک ہستی برباد رہے گی

فلسفہ میں اتنا درد پیدا کرنا مرزا یگانہ کا حصہ ہے۔ ہستی برباد کی ایسی تصویر کہیں نظر نہ آئی۔ غالب کی جدّت طرازی اک افسانہ ہی افسانہ ہے۔

(انسان مجموعۂ اضداد)

شیطان کا شیطان فرشتہ کا فرشتہ

انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

انسان کی بوالعجبی کا ثبوت ملاحظہ ہو۔ کلام کے جوش و خروش اور حقیقت و صداقت کا کیا کہنا۔

(آزادی محدود)

ہاں وسعتِ زنجیر تک آزاد بھی ہوں میں

ہستی مری مجموعۂ اضداد رہے گی

دیکھو اسے کہتے ہیں Fettered liberty آزادی کیا ہے آزادی نما گرفتاری ہے۔ اگر اسے آزادی بھی کہہ لو تو یہ ماننا پڑے گا کہ انسان آزادی و گرفتاری کا مجموعہ یعنی مجموعہ اضداد ہے۔

(زمانہ کی نیرنگی)

ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش
دُنیا یہی دُنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

اس شعر کی داد سکوتِ حیرت کے سوا اور کچھ نہیں۔

شہرہ ہے یگانہ تری بیگانہ روی کا
واللہ یہ بیگانہ روی یاد رہے گی

مصنف کے کیرکٹر کا آئینہ ہے۔

(دردِ دل)

درد سر تھا سجدۂ شام و سحر میرے لئے
درد دل ٹھہرا دوائے درد سر میرے لئے

(فلسفۂ زندگی)

"درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو"
زندگی پھر کیوں ہوئی ہے درد سر میرے لئے

پہلا مصرع خواجہ میر درد کا ہے۔ مگر اسی مصرع کے ساتھ دوسرا مصرع ایسا لگایا کہ فلسفۂ زندگی کا نیا رخ دکھا دیا۔

(حسن نادیدہ)

حُسن نادیدہ کجا اپنا ہی پردہ کھل گیا
آسمان ثابت ہوا حدِ نظر میرے لئے

اپنی نظر تو آسمان ہی تک پہنچ کر رہ گئی واہ رے کوتاہ نظری۔ بھلا حسن نادیدہ کا پتا کیوں کر لگے۔ کوتاہ نظری سے اپنا ہی پردہ کھل گیا۔ کیا غالب نے ایسے حقایق کو ان آسمانی الفاظ میں کبھی ادا کیا ہے۔

(فطرت مجبور)

فطرت مجبور کو اپنے گناہوں میں ہے شک
وا رہے گا کب تلک توبہ کا در میرے لئے

فطرت مجبور کو جب اپنے گناہوں میں شک ہے۔ اپنی خطا کی قائل نہیں۔ تو توبہ کیسی۔ در توبہ ناحق کیوں کھلا رہے۔

شکر سے تسکین نہیں ہوتی شکایت ہی سہی
کچھ وظیفہ چاہئے شام و سحر میرے لئے

کس محبت سے دل گم گشتہ دیتا ہے صدا
آ اِدھر پھرتا ہے آوارہ کدھر میرے لئے

لے چلا ہوں وعدۂ فردا گرہ میں باندھ کر
چاہئے ہے اور کیا زادِ سفر میرے لئے
(وعدۂ فردا۔ زادِ سفر)

بزمِ دنیا میں یگانہ ایسی بیگانہ روی
میں نے مانا عیب ہے لیکن ہنر میرے لئے
(بیگانہ روی)

نیشِ درد و نوشِ درماں بر نتابد ہر دلے
زیستِ مشکل مرگِ آساں بر نتابد ہر دلے
(مرگِ آساں)

مطلع وہ مطلع الانوار ہے کہ اہلِ عجم کے قلم سے بھی نکلتا تو مایۂ ناز سمجھا جاتا۔ نیشِ درد کا تقابل زیستِ مشکل سے اور نوشِ درماں کا تقابل مرگِ آساں سے جودتِ تخیّل کے حیرت افزا کارنامے ہیں۔ ہر دل نہ زیستِ مشکل کی تاب لا سکتا ہے نہ مرگِ آساں کی۔ نہ نیشِ درد ہر دل گوارا کر سکتا ہے نہ نوشِ درماں۔ نوشِ درماں کیا ہے وہی مرگِ آساں مگر اسے گوارا کر لینا آسان نہیں۔ نیشِ درد کیا ہے وہی زیستِ مشکل اس کی تلخیوں کو کوئی شاعر کے دل سے پوچھے۔

جلوۂ شامِ غریباں بر نتابد ہر دلے
منزلِ ہم رنگِ زنداں بر نتابد ہر دلے
(شامِ غریباں)

منزلِ ہم رنگِ زنداں کی معنویت پر غور کرو۔

(خزاں آبادِ عالم)

از خزاں آبادِ عالم خویش را دزدیدہ ایم

رنگ و بوئے ایں گلستان برنتابد ہر دلے

(بہارِ پُر خلش)

در بہارِ پُر خلش آسودہ نتواں زیستن

خار در پیراہن جان برنتابد ہر دلے

بہار کیسی ہے پُر خلش۔ اللہ ایسی پر خلش بہار میں کوئی آسودگی کی زندگی کیونکر بسر کر سکتا ہے۔ پیراہن جان میں جب کانٹے الجھے ہوتے ہوں تو آسودگی کیسی ایسی پر خلش زندگی کی تاب لانا ہر ایک کا کام نہیں یہ میں ہوں جو ایسی زندگی بسر کر رہا ہوں۔

(غمزۂ ناخواندہ مہمان)

خوش سر و کارے مرا با دردِ سر افتادہ است

غمزۂ ناخواندہ مہمان برنتابد ہر دلے

سجدہ تا صد سال بر خاکِ وطن نبود گراں

تکیہ بر دیوارِ زندان برنتابد ہر دلے

دست و پا گم گشته از اندیشهٔ تعبیر بد
یاد ئے از خواب پریشان برنتابد ہر دلے

(تہمت راحت)
تہمت راحت کشم در منزل واماندگی
پا بہ گل سر در گریبان برنتابد ہر دلے

(منزل موہوم)
منزل موہوم مارا پا بہ جولاں می برد
خاک بر سر بے سر و سامان برنتابد ہر دلے

(عیش پشیمان)
العطش اے ساقی خمخانہ غم العطش
نشۂ عیشِ پشیمان برنتابد ہر دلے

(اعجاز عشق)
دوزخ خود را بہشتے سازم از اعجاز عشق
جائے گل آتش بداماں برنتابد ہر دلے

(عقل و دیوانگی)
بہرہ از عقل جو یا فیضے از دیوانگی
پند پیر و سنگ طفلاں برنتابد ہر دلے

یاس امید و فا از لکھنو فکر محال
شیوہ ہائے نامسلمان برنتابد ہر دلے

متفرقات

جو دل نہیں رکھتا کوئی مشکل نہیں رکھتا
مشکل نہیں رکھتا کوئی جو دل نہیں رکھتا
کوثر بھی کھنچ آئے تو یہ نیت نہیں بھرتی
دریائے ہوس وہ ہے کہ ساحل نہیں رکھتا
کیوں یاسؔ قفس میں بھی وہی زمزمہ سنجی
ایسا تو زمانے میں کوئی دل نہیں رکھتا

ہاتھ بڑھتا نہیں تقدیر کی کوتاہی سے
آخری جام ہے اور دور سے ہم دیکھتے ہیں

چلتا نہیں فریب کسی عذر خواہ کا
دل ہے بغل میں یا کوئی دفتر گناہ کا
اب کیا لگے گا دل چمن روزگار میں
مارا ہوا ہے دیدۂ عبرت نگاہ کا
دنیا مقام ہو نظر آئے گی ناگہاں
ٹوٹے گا جب طلسم فریب نگاہ کا
دل کائناتِ عشق میں شاہو نکا شاہ ہے
مختار کل تمام سفید و سیاہ کا

ثابت ہوا کسی پہ نہ جرم وفا کبھی　　پردہ کھلا نہ عشق سراپا گناہ کا

ہمارے قتل کا وعدہ ہے غیر کے ہاتھوں　　عجیب شرط پہ ٹھہرا ہے امتحان اپنا

یاس اچھی نہیں گستاخی دشت وحشت　　دامن یار کو کیا اپنا گریبان سمجھا

بال و پر نوچ کے صیاد نے آزاد کیا　　حق خدمت جب اسیروں نے جتانا چاہا

فکر حاضر۔ جذب کامل ہو تو پھر کیا دور ہے　　سیر غائب خواب و بیداری میں یکساں دیکھنا

وحشت تھی ہم تھے۔ سایہ دیوار یار تھا　　یا یہ کہو کہ سر پہ کوئی جن سوار تھا
اللہ رے توڑ نیچی نگاہوں کے تیر کا　　اُف بھی نہ کرنے پائے تھے اور دل کے پار تھا

جب حسنِ بے مثال پر اتنا غرور تھا　　آئینہ دیکھنا تمہیں پھر کیا ضرور تھا

بجلی سی دوڑنے لگی پھر جسم زار میں　　دیواریں پھاندنے لگے وحشی بہار میں

یاد آیا ہے کہ تھا زندوں میں اپنا بھی شمار　　زور تھا اپنے قلم میں باڑھ تھی تلوار میں

دیوانے بن کے اُنکے گلے سے لپٹ بھی جاؤ کام اپنا کرلو یاس بہانے بہانے ہیں

خوشبو پر اپنی جامے سے باہر ہوئے ہیں گل جوبن پر آج مست ہیں کل کی خبر نہیں

موسم گل میں جو خاموش رہا کرتے ہیں وہ بھی اک معنی بے لفظ ادا کرتے ہیں

ہجوم یاس سے دل کا یہ حال ہوتا ہے شہید جیسے کوئی پائمال ہوتا ہے

اللہ مبارک کرے پیری کی سحر یاس مرنے کی تمنا تھی تو لے اب کہیں مر بھی

حسن نیت پہ مرے شاہد عصمت ہے گواہ خود حجاب آگیا جب یار کی صورت دیکھی
جھلملانے لگا جس وقت چراغ سحری مرتے کے بیمار نے ایک ایک کی صورت دیکھی
آنکھ جب بند ہوئی یاس تو پھر کچھ بھی نہ تھا اس طلسمات عناصر کی حقیقت دیکھی

اثر پیدا کیا چاہو سخن میں طرز دلکش سے تو انداز بیان سیکھو انیس و میر و آتش سے
پڑا رہنا برا کیا ہے ذرا تسکین تو ہوتی ہے کوئی چونکائے کیوں ظالم ترے بیمار کو غش سے
برا ہو یا بھلا کچھ حشر اپنا ہو چکے داور جہنم ہی سہی بیم و رجا کی اس کشاکش سے
گلہ کیا نشہ میں شیشے سے شیشے لڑ ہی جاتے ہیں مگر کھچنا نہیں زیبا کسی میکش کو میکش سے

ناخدا سے کم ہمت ہاتھ پاؤں مار آیا
نہ کی کیا خبر لاتا حوصلہ بھی ہار آیا

شوق میں رہائی کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں
دن پھرے اسیروں کے مژدۂ بہار آیا

یاس امید فردا نے واہ کیا تسلی دی
مضطرب نگاہوں کو حکم انتظار آیا

زندہ در گور رہوں موت آئے تو سر آنکھوں پہ
مگر ایسا نہ ہو مہمان کوئی نازل ہو جائے

ہاتھ الجھا ہے گریبان میں کھٹکے دیکھتے ہیں
اور امید کرے کیا کوئی غمخواروں سے

ایڑیاں وادیٔ غربت میں رگڑتے ہی رہے
دور کھنچتی گئی منزل وطن آوازوں سے

اُلٹی ہوا زمانے میں چلتی ہے آج کل
آثار کہہ رہے ہیں کہ محشر قریب ہے

کیا جانے ہم تک آئیگا محفل میں یا نہیں
اتنا تو دیکھتے ہیں کہ ساغر قریب ہے

لڑکھڑا کر ذرا کاندھے پہ سہارا جو کیا
ہاتھ کٹوائے ہیں ظالم نے مرے شانوں سے

سیر چمن سے دل نہ لگاؤ چلے چلو
فصل بہار پاؤں کی زنجیر ہو نہ جائے

نالوں نے زور باندھا ہے پھر پچھلی رات سے
اے چرخ چلتے چلتے کوئی تیر ہو نہ جائے

دل ہے اک جام خدا ساز پُر از کیفیت
شادی و غم سے کسی حال نہ خالی ہو گا

اور امڈے گا دل زار جہاں تک چھیڑو
یہ بھی کیا کوئی خزانہ ہے کہ خالی ہو گا

یہ تو فرمائیے کیا ہم میں رہے گا باقی — دل اگر درد محبت سے بھی خالی ہوگا

اجل کو کیا خبر دل میں اسیروں کے جو ارماں تھا — نکلتے بیٹھتے دن تھے بہار آنے کا ساماں تھا
وہی سر ہے کہ اب سنگ حوادث کا نشانہ ہے — یہی سر تھا کہ جس پر سایۂ دیوار جاناں تھا

پاؤں سوئے ہیں مگر جاگتے ہیں اپنے نصیب — کیا سمجھ کر جرس گنگ جگاتا ہے مجھے

اکثر امیدوار رہائی جو مر گئے — میرے خیال خام کی اصلاح کر گئے
اب کون ہے جو حسن طلب کا جواب دے — جانباز تیرے وقت سے پہلے ہی مر گئے
اپنی خبر نہیں تو مزہ کیا گناہ کا — لذت کہاں جب آپ ہی حد سے گزر گئے

خاکساری نے کیا بے سروساماں مجھ کو — سحر عید بھی ہے شام غریباں مجھ کو

یاس کے بیڑے کو گرداب بلا میں ڈال کر — ناخدا ظالم کھڑا ہنستا ہے اب ساحل کے پاس

عجب انداز ہے چرخ ستمگر کی شرارت کا — زباں کو مل نہیں سکتا کوئی پہلو شکایت کا

کیا کہیں اُڑ کے جا نہیں سکتے
وہ چمن ہے وہ آشیانہ ہے

نوح کا طوفان جن کے حق میں ہو بادِ مراد　　وہ کبھی قائل نہ ہوں گے گردشِ تقدیر کے

قطعہ

مبارک ہو کسی کی جستجو میں دربدر ہونا　　وطن کو چھوڑ کر آلودہ گردِ سفر ہونا
اندھیری رات میں ہر ہر قدم پر ٹھوکریں کھانا　　بلند و پست سے راہِ طلب میں بیخبر ہونا
فلک چکر میں آیا ہے مری ایذا پسندی سے　　خیالِ خام تھا مجھ پر جفاؤں کا اثر ہونا

دلِ بے حوصلہ تکتا ہے خریدار کی راہ　　کوئی گاہک نہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے کا

خوگر نہیں ہیں ہم ایسی خاموش زندگی کے　　ہیں مشورے فلک سے اب جنگِ زرگری کے
احکامِ حق سے اکثر منہ موڑتے ہیں سرکش　　پابند ہیں تو کس کے اک حکمِ آخری کے
ظاہر میں خضر صورت۔ باطن میں غول سیرت　　زاہد بھی آدمی ہے یا بھیس میں کسی کے
کیا جانیں خونِ ناحق یا آبِ آتشین تھا　　کچھ سوجھتا ہے واعظ غلبہ میں تشنگی کے
دیکھی زمین کسی نے پہنچا کوئی فلک پر　　دُردِ ملالِ مے کا ایک ایک گھونٹ پی کے

کنجِ قفس میں دل کے بہلنے کا کوئی ساماں نہیں　　موسمِ گل تک دن گننا بھی مشکل ہے آساں نہیں
کیسی جفائیں کیسی دعائیں آج مرے کل دوسرا دن　　عشق کی دنیا دیکھ چکے اب جینے کا ارماں نہیں
ہوش میں آنا اور غضب ہے خوب گزرتی ہے غش میں　　درد کی لذت کون اٹھائے جان میں اپنی جان نہیں

فریادِ اُمت ... ۴ر
نالۂ یتیم ... ۲ر
دیوانِ میر درد ... ۶ر
قصائد ذوق ... ۶ر
مقالات ... عہ ۸ر
عروض سیفی ... ۸ر
بحر العروض ... ۶ر
المامون ... عہ ۸ر
الفاروق ... عہ ۸ر
غزلیاتِ نظیری ... عا
رباعیاتِ ابو سعید ابو الخیر ... عہ
ترجمہ ״ ״ ... ۱۲ر
مخزن اسرار نظامی ... ۱۰ر
مقاماتِ حمیدی ... ۸ر
ترجمہ ״ ... عہ ۸ر
حدائق البلاغت ... ۱۲ر
ابو الفضل اول وسوم ... عہ ۸ر
ترجمہ دفتر اول ... عہ
قصائد قاآنی الف ب ... عہ
عقد الآلی ... عہ

حل لطیف ۸ر | عود ہندی ۱۲ر
مطالب الغالب مجلد ستہ | اردوئے معلی عا ۸ر
نقش بدیع عا ۸ر | یادگار غالب ستہ

مقدمہ دیوانِ حالی ... عا ۸ر
حاجی بابا اصفہانی ... ستہ
شعر العجم حصہ اول ... ستہ
״ ״ حصہ دوم ... عا ۸ر
״ ״ حصہ سوم ... عا ۸ر
״ ״ حصہ چہارم ... عا ۸ر
״ ״ حصہ پنجم ... عا
درۂ نادرہ ... للعہ
پیام مشرق ... ؎ ۸ر
یوسف شاہ سراج ... عہ
انتخاب مخزن حصہ اول ... عہ
״ ״ حصہ دوم ... عہ
״ ״ حصہ سوم ... عا
ترجمہ غزلیاتِ نظیری ... ؎
تاریخ اسلام غلام قادر فصیح ... ھر
ترجمہ رسائل طغرا ... عا
تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ... عا ۸ر

To

The German Nation, the staunch friend of the Eastern Classics.

Mirza Yas Yagana

66, Shahganj
Lucknow.

6-3-27